شعلہ

واجدہ تبسم

شُعلے

(ناولٹ)

واجدہ تبسّم

رفعت پبلشرز ○ شاہراہِ قائدِ اعظم ○ لاہور

سرورق : مس حوزیہ صدیقی

بار : دوم دسمبر ۱۹۹۹ء

ناشر : ریاض ملک، رفعت پبلشرز لاہور

طابع : [illegible] عالم پریس لاہور

قیمت : [illegible] روپے

ترتیب

راکھ
انگارے
شعلے

○ ○

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ گندم کا دانہ جو
زمین پر گر جائے، زندہ رہے تو وہ تنہا رہتا ہے
لیکن مر جانے پر بہت کچھ پھل لاتا ہے۔

"یوحنا"

ابتدائیہ

گزشتہ دس برس سے میں واجدہ تبسم اور اس کے فن سے واقف ہوں ۔ دہلی سے "شمع" والوں نے ایک ہفت روزہ "آئینہ" نکالا تھا ۔ اور ظ ۔ انصاری اس پرچہ کی ادارت میں تھے ۔ مدیر صاحب نے "میری یادداشت" کے عنوان سے ایک سلسلہ جاری کیا تھا ۔ اسی ضمن میں ایک دن ہمیں واجدہ کا ایک مضمون اسی کالم کے لیے موصول ہوا ۔ مضمون پر ہم نے بہت دیر تک گفتگو کی ۔ اور نتیجہ نکالا کہ اردو میں مدت کے بعد ایک نئی خاتون اپنی تمام تر چونکا دینے والی صلاحیتوں کے ساتھ وارد ہو رہی ہے ۔ واجدہ کی غالباً یہ سب سے پہلی تحریر تھی ۔

ایک دو برس کے عرصہ میں ہی واجدہ کے افسانوں نے اردو داں طبقہ کو چونکا دیا ۔ اور اس کے ہم عصر افسانہ نگار دب کر رہ گئے ۔ واجدہ کے فن میں چند ایسی نسائی جبلتیں کارفرما ہیں ۔ جنہوں نے اس کے فن میں انتہائی نکھار اور بلندی پیدا کر دی ہے ۔ یہ نسائی انداز اور احساس صرف مشرق کی عورت تک محدود ہے ۔

دوسری قابل ذکر خاصیت وہ فنی صداقت ہے جس میں جذبہ کا مؤثر ابلاغ شامل ہے ۔ فن ــــ جو احساس کی گرفت کو توڑ کر تخیل کے شہپر پر اڑتا ہوا انسان کے انفرادی اور اجتماعی احساس پر ایسی نشتر زنی کرتا ہے ۔ جو اسے بے تاب و بے قرار کر دے ۔

یہی فنی صداقت اور تاثر کسی بھی فن کار کی کامیابی کی ضمانت بن سکتا ہے ۔

واجدہ تبسم بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہے ۔ زیرِ نظر ناولٹ شعلے اگرچہ ناول کی حدود کو نہیں چھو سکا لیکن اپنے بھرپور تاثر اور فنی صداقت کی وجہ سے مدتوں پڑھنے والوں کے دلوں کو تڑپاتا رہے گا ۔

محمود ہاشمی ۔ کراچی

○

(۱)

راکھ

جوبلی ہل کے اس موڑ پر جہاں سے حیدرآباد کی اکثر و بیشتر سڑکیں صاف نظر آتی ہیں اسلم صاحب کی عظیم الشان کوٹھی ۔ یہ شاندار کوٹھی اور بڑا بھاری کاروبار انھیں اپنے ورثہ میں ملا تھا، اس کے علاوہ انھیں اپنے ماں باپ سے جو ذہنی ورثہ ملا تھا، اس میں نیکی اور انسانی احساسات کے وہ تمام جوہر موجود تھے، جن کی مثالیں دی جاتی ہیں۔

دسمبر کی بھیگی ہوئی گلابی رات تھی، ایسی رات جس میں کنوارپن کی آنچ مہک جاتی ہے، ایسی رات جب نکہتوں کی نرم روی سے احساس کے رخساروں پر ماضی کی برف گرنے لگتی ہے۔

خاموشی، تنہائی اور سرد مہری کے آغوش میں ڈوبی اس رات کی پیشانی پر پانی کے چند قطرے لرز رہے تھے۔ اسلم صاحب کی عمر بہت زیادہ نہیں تھی۔ جوانی کے خواب ان کی آنکھوں میں ابھی سنجیدہ تعبیر ہی بن پائے تھے کہ شاہینہ ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔ شاہینہ جو صرف ان کی رفیقۂ حیات ہی نہ تھی۔ بلکہ ان کے احساس، ان کی روح کا ایک اہم جزو تھی۔ اور جب شاہینہ کا انتقال ہوا تو موت کے شہتیر کو انھوں نے اپنے شانوں پر محسوس کیا۔ لیکن اپنے تین معصوم بچوں کو دیکھ کر، وہ اکثر و بیشتر یہ محسوس کرتے، جیسے موت کے شہتیر کا بوجھ ان کے شانوں سے ٹوٹ گرا ہے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ ان تینوں کی آنکھوں میں انھیں شاہینہ کا تمام تر عکس نظر آتا تھا، اور وہ ان تینوں کو ایسی امانت سمجھتے تھے جو انسان کی قسم اور انسان کے ایمان کی روح ہو —— یہ بچے —— شاہینہ کی یاد —— ایک بے ہنگم لیکن عظیم الشان کوٹھی —— عظیم الشان کوٹھی میں ایک ایک دیوار، ایک ایک چیز اور باغ میں پھولوں کی پتیوں پر جگہ جگہ بکھری ہوئی شاہینہ کی یادوں کی خوشبو بچوں کے رخساروں، شانوں اور پیشانی پر شاہینہ کا لمس۔ ماضی کا کیف اور حال کی سردنا کی یہی سب کچھ اسلم صاحب کی دنیا تھی۔

دن بھر وہ اپنے وسیع ترین کاروبار میں مصروف رہتے۔ دن میں ایک دو بار اپنے بچّوں کے متعلق نوکروں کو ہدایات دیتے اور شام ہو جانے پر وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر اپنے احساس کی انگلیوں سے اپنے ماضی کو کریدنے لگتے۔ ان کے ماضی میں صرف ایک ہی احساس تھا، اور وہ تھا شاہینہ کا پیکر ۔۔ شاہینہ کا پیار، شاہینہ سے لڑائی اور سچ تو یہ تھا کہ شاہینہ کی زندگی میں انھیں شاہینہ سے اتنا لگاؤ نہ رہا تھا، جتنا اب اس کی یاد سے تھا۔

یوں تو اسلم صاحب پینتالیس کے لگ بھگ تھے، لیکن دولت کی فراوانی نے ان پر بڑھاپے کو حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔

ان کی زندگی کی بے کیفی، تنہائی اور احساس محرومی کی کئی وجوہات تھیں۔ اول تو یہ کہ شاہینہ ان کی زندگی کے جوانی جیسے سنہری دور میں ایک طویل عرصہ تک ان کی زندگی رہی اور جدا ہو گئی۔ پھر تین بچّوں کی یتیمی، کچھ جنس کی ایسی لپک، جو شریف دولت مند انسانوں میں اندر ہی اندر سلگتی ہے۔ وہ یوں بھی سوچتے تھے کہ کیا اس بھری ہوئی دنیا میں، انھیں شاہینہ کا اب کوئی دوسرا جواز نہیں مل سکے گا۔؟

اسلم صاحب کے بعض دوستوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ شاہینہ سے شادی کرنے سے قبل انھوں نے کسی لڑکی سے محبت بھی کی تھی۔ یہ

محبت کچھ زیادہ دنوں تو نہیں چل سکی تھی، وجہ یہ تھی کہ جلد ہی اسلم صاحب کو یہ معلوم ہو گیا تھا۔ کہ ان سے زیادہ ان کی دولت پر فریفتہ ہے۔ انکی محبوبہ نے ایک دو بار نہیں، بلکہ کئی بار اس کی کوشش بھی کی تھی کہ دونوں کے درمیان جسمانی رشتہ ہموار ہو جائے۔ اسلم صاحب کی جمالیاتی حس خالص مشرقی تھی، انھیں کنوارپن کی پاکیزگی، معصومیت، مشرقی حیا، اور عصمت مآبی یہ سب چیزیں متاثر کرتی تھیں۔ ان کی محبوبہ کی ایسی پیش قدمی انھیں پسند نہ آئی تھی اور وہ خود بخود اس سے دور ہوتے گئے تھے۔

بیوی کے انتقال کے بعد ان کی راتیں انتہائی پُرسوز اور ویران ہو چکی تھیں، وہ بہت دیر تک رات کی خاموشی میں ڈوبے رہتے۔ کبھی سلگ اٹھتے، اور کبھی اپنے بچّوں کی بابت سوچ کر بجھ جاتے ۔۔ اسی طرح انھوں نے ایک برس گزار دیا تھا۔

"آج کرسمس ہے پاپا — ہمیں اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے کیا — ؟"

اسلم صاحب کی بڑی لڑکی سلمیٰ ان سے پوچھ رہی تھی۔

"کرسمس کی شام کلبوں میں بڑی بدتمیزی ہوتی ہے، بیٹیا، تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔" اسلم صاحب نے اپنا کوٹ پہنتے ہوئے سلمیٰ کو جواب دیا، لیکن سلمیٰ بحث کرنے کے موڈ میں تھی۔

"لیکن آپ تو جارہے ہیں، پاپا —— کیا کلبوں کی وہ بدتمیزی آپ پر اثر انداز نہیں ہوگی — ؟"

اسلم صاحب نے کچھ جھلاہٹ سے سلمیٰ کی جانب دیکھا۔ دیکھتے

رہے اور سلمیٰ کے چہرے پر کھلی ہوئی معصومیت اور اس کی آنکھوں کے بھولے پن سے ایسے متاثر ہوتے گئے۔ جیسے تنی ہوئی کمان ڈھیلی پڑ جائے۔

بیٹی! اِنسان جب تجربات کی آگ میں تپ کر کُندن بن جاتا ہے، تب اُس پر کوئی وار اثر نہیں کرتا۔ ہم نے زندگی بھر ایسے موقعوں پر اپنے دامن کو بچانا سیکھا ہے۔ ہم پر کوئی آگ اثر نہیں کر سکتی —— تم ابھی بچی ہو۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ ہم تم سے جو کچھ کہیں تسلیم کرو۔

سلمیٰ اپنے پاپا کے دلائل سے متاثر ہوئی یا نہیں لیکن انہوں نے چونکہ ایک حکم لگا دیا اس لئے خاموش ہو گئی۔

اسلم صاحب کمرے سے نِکل چکے تھے، پھر کچھ سوچ کر واپس آئے —— سلمیٰ سے کہا۔

"بیٹی تم آپا کے ساتھ چلی جانا، بازاروں کی رونق دیکھنا اور گھوم پھر کر واپس آجانا ——"

کرسمس کی رات سے اسلم صاحب کا کوئی جذباتی تعلق نہیں تھا، لیکن کاروباری دُنیا میں رہ کر کاروباری لوگوں سے گریز بھی مشکل تھا۔ کامرس چیمبر کے ایک ممبر کی حیثیت سے آج انہیں الف لیلیٰ میں ڈنر ڈانس میں شریک ہونا تھا۔ اسلم صاحب چاہتے تھے کہ کم سے کم وقت وہ الف لیلیٰ میں گزاریں۔

اس لیے خاصی تاخیر سے وُہ کلب پہنچے۔

شہر بھر کے بزنس مین، سرکاری عہدیداران، خاندانی رئیس سب ہی جمع تھے۔ اُن میں اکثر حضرات سے اسلم صاحب کی خاصی بے تکلفی تھی۔ اسٹار انٹرنیشنل کے مینجنگ ڈائرکٹر مسٹر کوہلی جو اُن کے بے تکلف دوست تھے ان کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ ہال میں ہلکے نیلے رنگ کی روشنی تھی۔ شراب کے جام کھنک رہے تھے اور سگریٹ کے دھوئیں سے فضا مٹگجی ہو رہی تھی۔

مسٹر کوہلی اسلم صاحب کے چہرے کو بغور دیکھ کر بولے۔

"یار ــــ اسلم صاحب! معلوم ہوتا ہے، کسی سے عشق کر بیٹھے ہو۔ اس قدر اُداس ہو ـــ اور ہاں یار وُہ تمہاری سیکرٹری مس مونا تو یار غضب کی ہے کہ کبھی دعوت ہو جاتی ہے!"

اسلم صاحب کچھ خفیف سے ہو کر مسکرا دیئے۔

کوہلی صاحب پھر بے تکلفی سے بولے۔

"یار اسلم صاحب! تم شاید سیکرٹری کے معنے بھی نہیں جانتے، اور اتنی خوبصورت لڑکی کو سیکرٹری بناتے ہوئے ہو۔ حق تمہارا ہے لیکن وہ تمہارا چیف کا ڈنٹ ہمیش کرنا ہے اُس کے ساتھ۔ زرے چند معلوم ہوتے ہو۔"

کوہلی صاحب ابھی بات ختم کرنے کے موڈ میں نہیں تھے کہ مس شاہینہ پیانو پر نظر آئیں۔ شاہینہ نہایت لطیف اور عکسی لباس پہنے ہوئے تھی۔

مسٹر کوہلی نے اسلم کے پہلو میں چٹکی لی ۔ اسلم صاحب بالکل خالی الذہن تھے۔ انہیں اس ماحول سے، شراب سے، شاہینہ کے جسم سے جھانکتی ہوئی کیفیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ مسٹر کوہلی کی اس چٹکی کا مقصد سمجھ کر انہیں انتہائی کوفت ہوئی اور کچھ جھلا سے گئے ۔

شہر کی مشہور ترین گانے والی شاہینہ پیانو پر ایک غزل گا رہی تھی ۔ پورا ہال جھوم رہا تھا ، تمام ماحول پر نیم غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی ۔

ایک ایک جھروکہ خندہ بلب ایک ایک گلی کہرام
ہم لب سے لگا کر جام ہوئے بدنام بڑے بدنام
رُت بدلی کہ صدیاں لوٹ آئیں اُف یاد کسی کی یاد
پھر سیلِ زماں میں تیر گیا ، اِک نام کسی کا نام
دل ہے کہ اِک اجنبی حیراں ، تم ہو کہ پرایا دیس
نظروں کی کہانی بن نہ سکیں ، ہونٹوں پہ رکے پیغام
روندیں تو یہ کلیاں نیشِ بلا ، چومیں تو یہ شعلے پھول
یہ غم یہ کسی کی دین بھی ہے ، انعام عجب انعام

شاہینہ کی آواز میں غضب کا سوز تھا ۔ اسلم صاحب اس آواز کے کیف سوز، شاہینہ کے نام سے قدیم وابستگی اور اس دھیمے دھیمے سلگتے ہوئے لمحوں کی آنچ میں ڈوب کر ابھر رہے تھے ۔ آج زندگی میں پہلی بار زندگی سے کچھ نئی نئی

سی وابستگی محسوس ہو رہی تھی ——— انہیں یاد آرہا تھا کہ سلمیٰ
نے اُن سے کہا تھا۔

"پاپا کلب کی بدتمیزی کیا آپ پر اثر انداز نہیں ہوگی" پھر کوہلی کی گفتگو
یاد آ رہی تھی۔ اور انہیں احساس ہو رہا تھا کہ وُہ واقعی چغد ہیں۔
نرے چُغد۔ اور سیکرٹری واقعی خوب لڑکی ہے اور زندگی واقعی
اتنی بیکار شے نہیں ہے۔

شاہینہ بڑے پُر سوز انداز میں غزل گا رہی تھی۔ اور یہ غزل اسلم
صاحب کے رگ و پے میں اُترتی جا رہی تھی۔

اے تیرگیوں کی گھومتی رَو کوئی تو سیلِ صبح
اے روشنیوں کی ڈھلتی لو اِک شام اِتشیلی شام
رہ رہ کے جیالے راہیوں کو دیتا ہے کون آواز
کرنوں کی ہنستی منڈیروں پر تم ہو کہ غمِ ایّام
بے برگ شجر، گردوں کی طرف پھیلائیں ہُمکتے ہات
پھولوں سے بھری ڈھلوان پہ سوکھے پاکریں بسرام
ہم فکر میں ہیں اِس عالم کا دستور ہے کیا دستور
یہ کس کو خبر اِس فکر کا ہے دستور دو عالم تمام

غزل ختم ہو چکی تھی لیکن پیانو کے ساز کی لوٹتی ہوئی دھیمی لے کے ساتھ تمام

محفل کا دِل ڈوب گیا۔ اسلم صاحب نے اِس طرح آنکھیں کھولیں جیسے وہ کوئی عجیب سا خواب دیکھ رہے تھے۔ سارے ماحول کی آنکھیں غزل کے کیف سے کچھ نیم واسی تھیں، شاہینہ پیانو سے اُٹھ کر آ رہی تھی، ایک ایک ٹیبل سے ہوتی ہوئی، داد لیتی ہوئی اور لوگوں کے دلوں کو گرماتی ہوئی اَب وُہ اسلم صاحب کے ٹیبل کے قریب آ چکی تھی۔ سب نے اُٹھ کر شاہینہ سے ہاتھ ملایا، داد دی، اسلم صاحب کا ہاتھ شاہینہ کی جانب بڑھا اور وہ دھیمے لہجے میں صرف اِتنا کہہ سکے۔

"اِک نام کِسی کا نام ——— واہ کیا نام ہے ؟"

اَب ڈانس شروع ہونے والا تھا، ہال میں کھڑے ہوئے لوگ اپنی بو ٹائی درست کر رہے تھے۔ اسلم صاحب نے اپنے قیام لندن کے دوران کئی بار رقص کیا تھا۔ آج رقص کیلئے اُن کی خواہش تھی، دِل دھڑک رہا تھا، لیکن قدم نہیں اُٹھ رہے تھے۔ ابھی وہ پوری طرح خود کو سنبھال بھی نہ پائے تھے کہ ایک عورت نے اُن کے شانوں پر ہاتھ رکھا، "ہیلو" مسٹر اسلم۔ آیئے آج تو آپ ہی کے ساتھ ڈانس میں شریک ہوں گی"

یہ باتھم لمیٹڈ کے ڈائرکٹر کی پرائیویٹ سیکرٹری مس روزی کے ہاتھ کا لمس اپنے شانوں پر اِس طرح محسوس کیا، جیسے کِسی مزدور کی کھوئی ہوئی اکنّی ریت میں سے مِل جائے۔

بہت دنوں کے بعد خود اپنے آپ سے اُنہیں اپنائیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ مس روزی کو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خود بخود بلکل غیرارادی طور پر اُن کے ہاتھ مس روزی کی کمر تک پہنچ گئے۔ اب وُہ رقص نہیں کر رہے تھے بلکہ بلکل بے بس ہو کر مس روزی کے ساتھ چل رہے تھے۔ قدم اُٹھ رہے تھے، لیکن بے ترتیبی سے۔ آنکھیں شرمساری، جسم کچھ ڈھیلا ڈھالا، ارادوں میں کچھ توانائی، لیکن جلد ہی وُہ مس روزی کو چھوڑ کر ایک خالی ٹیبل پر آکر بیٹھ گئے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا، جیسے ابھی ابھی اُن سے کوئی گُناہ سرزد ہو رہا تھا، لیکن وُہ بچ گئے ہیں۔ تھوڑی دیر خالی نظروں سے رقص کرنے والوں کے قدموں کو دیکھتے رہنے کے بعد وُہ اچانک اُٹھے اور الف لیلیٰ سے باہر آ گئے۔ رنٹ پاتھ پر وُہ کافی دُور تک پیدل چلتے رہے۔ نہ معلوم کیوں وُہ اپنے قریب سے گزرنے والے ہر شخص سے کترا رہے تھے۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُن کے چہرے پر یا کپڑوں پر کوئی ایسا نشان لگا ہوا ہے، جسے سب دیکھ رہے ہیں اور اُن کا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔

الف لیلیٰ اور اسلم صاحب کی کوٹھی کا فاصلہ کوئی سات منٹ کا تھا، انہوں نے اس قدر تیز قدم اٹھائے تھے کہ چار منٹ میں ہی کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہو چکے تھے۔ انہوں نے مڑ کر سڑک کی جانب

دیکھا، کہیں کوئی اُن کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ لیکن اُن کی جانب کسی کی نگاہ نہیں تھی۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور سوچنے لگے نا کردہ گناہوں کا احساس کتنا بھیانک ہے۔ اَب وُہ آگے بڑھ رہے تھے، لیکن اُن کی نگاہوں میں اپنے تینوں بچّوں کی شکل گھوم رہی تھی جیسے اُن کی لڑکی سلمٰی ان سے کچھ پوچھ رہی ہو۔

کمرے میں ابھی تک بچے شور و غل مچا رہے تھے۔ اسلم صاحب دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئے۔ لیکن ان کی آہٹ سے بچّوں نے پہچان لیا کہ ڈیڈی آ گئے ہیں۔

"کیوں ڈیڈی ـــــــ آپ کلب گئے تھے نا ـــــــ اور وہاں ـــــــ"

سلمٰی اُن کے چہرے پر اِنتہائی سنجیدگی دیکھ کر بولتے بولتے ٹھٹھر سی گئی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اسلم صاحب نے کہا۔

"ہاں ـــــــ بیٹی ـــــــ وہ ـــــــ کچھ دوست ـــــــ ہمیں اپنے ساتھ لے گئے تھے نا ـــــــ وُہ ہماری کامرس چیمبر کے ممبر ہیں نا ـــــــ"

اسلم صاحب کے جواب پر سلمٰی پھر بولی۔

"دیکھئے نا ڈیڈی پہ ـــــــ آپا ہمیں لے کر نہیں گئی اور دیکھئے نا ڈیڈی

آج شام سے نجمی کو بخار آرہا ہے ۔ اُس نے آئس کریم خوب کھائی تھی اَب بخار آگیا اَور انوار الماری پر سے گر پڑے یہ کپڑے نکال رہے تھے ۔ آپا کو بلایا وہ آئی نہیں تو اُوپر والے خانے میں چڑھ گئے ۔"

اسلم صاحب اِن دونوں خبروں سے پریشان ہو گئے ۔ وُہ روز جب گھر آتے ایسی ہی شکایات سے دوچار ہونا پڑتا ۔ انہوں نے اپنے بچوں کو ماں کی طرح سینے سے لگایا ۔ نجمی کو پیار کیا ۔ انوار کے پیروں پر ہاتھ پھیرا اَور سب کو تسلّی دی ۔

"کوئی بات نہیں ، ہم تمہارے لئے ایک گورنس کا اِنتظام کر رہے ہیں ۔"

"نہیں ڈیڈی ۔ ہمیں تو ایک اچھی سی ممّی لا دیجئے ۔"

"انوار نے کہا ——— "ڈیڈی ہمارا کلاس فیلو ہے نا ، روبی ۔ اُس کی ممی مجھے بہت اچھی لگتی ہیں ، ایسی ہی ممّی لا دیجئے ۔"

اسلم صاحب کچھ افسردہ سے ہو کر بولے ——— "ہاں ، ہاں بیٹا ——— ممی بھی لادیں گے ——— "

دہی دسمبر کی رات ہے آسمان پر ابر پارے بکھرے ہوئے ہیں ۔

چاندنی کچھ اداس اداس ریت کے ذرّوں سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔ جوبلی ہل کے سائے میں جہاں چٹانیں ختم ہوتی ہیں مزدوروں کی جھونپڑیاں ہیں۔ کسی کسی جھونپڑی میں دیئے کی روشنی نظر آ رہی ہے جو بار بار ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے کانپ جاتی ہے۔ اِن جھونپڑیوں میں تلنگانہ کی سیاہ اور کرّیل عورتیں اپنے جفاکش مردوں اور میلے کچیلے بچّوں کے ساتھ سو رہی ہیں۔ خنکی برابر بڑھ رہی ہے لیکن اسلم صاحب ابھی تک دریچے کے قریب لگے ہوئے لیموں کے چھوٹے چھوٹے درخت چاندنی میں نہائے ہوئے کوئی کہانی سُنا رہے ہیں۔ شاید اسلم صاحب یہی کہانی سُن رہے ہیں۔ شاید یہ اُن کی اپنی کہانی ہے۔

ایک گوشت و پوست کا اِنسان، جس کے پاس بہت سی دولت بھی موجود ہے، اِنسانی احساس کی تشنگی کا مارا ہوا ہو تو دولت کسی کام نہیں نہیں آتی۔ زندگی ایک رات ہے۔ رات جونشیلی بھی ہوتی ہے اور تنہا بھی اُداس، تاریک اور روشن بھی۔ اِس رات کیلئے اِس زندگی کیلئے انسان کو ایک آشنا کی ضرورت ہوتی ہے جس کے سہارے یہ تمام زندگی گزار دی جائے۔ لیکن اسلم صاحب کو سہارا صرف اپنے لئے ہی نہیں، اپنے احساس کیلئے ہی نہیں ان معصوم بچّوں کے لئے بھی تو چاہیئے جن کا مستقبل اِس قدر دولت کے باوجود بھی خوش گوار نظر نہیں آتا۔ اور

پھر زندگی تو لمحاتی لذتوں کا نام ہے۔ مستقبل کی نہ بھی سوچیں تو حال کی بات کسی طرح بھی درگزر کے قابل نہیں۔

اسلم صاحب یہی سب کچھ سوچ رہے تھے اور شاید لیموں کے ننھے ننھے پودے بھی یہی سرگوشی کر رہے تھے۔ پھر انہیں اچانک شاہینہ کا خیال آگیا۔ کلب والی شاہینہ انہیں اپنے ہاتھ پر اُس کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ جیسے وہ اَب بھی اُس سے ہاتھ ملا رہے ہوں۔ اور وُہ غزل، وُہ کیف آور غزل جسے سُن کر اُن کا سویا ہوا انگ انگ اور رواں رواں بیدار ہوگیا تھا۔

ہم لب سے لگا کر جام ہوئے بدنام بہت بدنام

غزل دوبارہ اُن کے کانوں میں گونجنے لگی۔ مسٹر کوہلی کی باتیں یاد آئیں اور انہیں خیال آیا کہ نامعلوم وُہ کونسا احساس تھا جس کے سبب کلب سے نکلنے پر اُنہیں خود اپنے آپ سے شرم آ رہی تھی۔ کیا تین بچّوں کے بعد یا ایک بیوی کے مر جانے پر عورت کے متعلق سوچنا ہماری تہذیب اور اخلاق سے بعید ہے۔؟ کیا اخلاقی پیمانے اس قدر تنگ ظرف ہیں، کہ اُن میں انسانی نفسیات یا انسانی فطرت کی جزئیات کو سمونے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے ——؟ کیا عشق کے تصوّر کے ساتھ عمر کا تعین بھی ضروری ہے ——؟ اُف کتنا عجیب ہے یہ احساس اور کتنا عجیب ہے

یہ ماحول یہ تہذیب اور اس کے معیارات ـــــ! وہ جھلّا رہے تھے۔ اور یکے بعد دیگرے سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے۔ انہوں نے آدھ جلی سگریٹ کی جانب غور سے دیکھا اور ایک مصرع گنگنا کر رہ گئے۔

تو بھی جلتی ہے، مَیں بھی جلتا ہُوں

شاہینہ حیدر آباد کی بہترین سنگر تھی۔ الف لیلیٰ میں گزشتہ دو ماہ سے ہر شام اُس کا ایک پروگرام ضرور ہو رہا تھا۔ شہر بھر میں شاہینہ کی آواز کے لوچ اور اس کے ساتھ اُس کے جسم کے لوچ کا تذکرہ عام تھا۔ اسلم صاحب نے کئی بار اخبارات میں اور اپنے دوستوں کی زبانی شاہینہ کے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ لیکن انہیں مطلق احساس نہیں ہوا کہ شاہینہ کا گانا وُہ سنیں۔ یا اُسے دیکھیں کرسمس کے روز جب اُنہوں نے شاہینہ کو دیکھا اور اُس کی آواز کا جادو انہیں اپنے ثقیل قلب و جگر پر وار کرتا ہوا محسوس ہُوا تو انہیں شاہینہ سے بار بار ملنے کی خواہش ہوئی لیکن اس خواہش پر اُن کا دماغ ان کا ساتھ نہیں دے سکا تھا۔ اِس لئے پھر دوبارہ وہ کبھی

الف لیلیٰ نہیں گئے۔

شاہینہ اب حیدر آباد کا دورہ ختم کر کے یہاں سے روانہ ہونے والی تھی۔ اخبارات میں اعلانات شائع ہو رہے تھے۔

"غزل کا ردیف
نغموں کی مسیحائی اور
حیدر آباد کی سرزمین پر
شاہینہ ——————
فطرت کی نغمہ ریز
آواز ——— آخری
دو دن ——— الف لیلیٰ میں

یہ اعلان اسلم صاحب نے بھی پڑھا۔ کچھ گھومتے ۔ دفتر میں اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے، انہوں نے یہ اعلان پڑھنے کے بعد جب بھی ٹیلی فون کا کوئی نمبر ڈایل کیا تو انہیں یہی جواب ملا کہ۔

WRONG NUMBER PLEASE

وہ کچھ پریشان سے رہتے، جیسے بہت ساری باتیں اور بہت سارے کام بھول گئے ہوں۔ سکریٹری نے کچھ خطوط کے ڈرافٹ کر کے شی کے لیے دیئے تو انہیں چیک کرنے کے بجائے ان پر دستخط کر دئے۔

ملاقاتیوں سے کہلوادیا کہ صاحب مصروف ہیں، کہیں باہر کام سے جارہے ہیں۔ آج نہیں ملیں گے۔ ان کے ذہن میں شاہینہ سے ملاقات کی خواہش صاف طور پر موجود نہ تھی، لیکن اپنی بدحواسی کی وجہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

بہت دیر کچھ پریشان سا رہنے کے بعد انھوں نے الف لیلیٰ کا نمبر ڈایل کیا۔ یہ نمبر بالکل صحیح مل گیا تھا۔ نمبر ڈایل کرتے وقت بھی ان کا ذہن خالی تھا۔ دوسری جانب سے جب ہیلو کی آواز آئی تو انھوں نے اس طرح چونک کر جیسے سوتے میں کسی سے گفتگو کر رہے ہوں کہا۔

"ہیلو ——— میں اسلم بول رہا ہوں۔"

"شکریہ ——— ذرا مس شاہینہ کو بلایئے۔"

ساری گفتگو بالکل غیر ارادی طور پر ہو رہی تھی، اور اب شاہینہ نے دوسری جانب ریسیور اٹھایا تھا وہ کہہ رہی تھی۔

"جناب میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں۔
تو مضائقہ نہیں ——— آخر آپ نے
یاد کر ہی لیا۔"

"جی ——— میں تو ——— اپنے آپ کو
خوش قسمت سمجھ رہا ہوں ———"

"ذرہ نوازی ہے جناب کی ——— کیا

مجھے اپنے دفتر میں یاد فرمانا چاہتے ہیں آپ ـــــ ؟"
اسلم صاحب گھبرا گئے۔ انھوں نے نظر اُٹھا کر کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا، جیسے کوئی دروازے کی پشت پر کھڑا ہوا یہ گفتگو سن رہا ہے۔

"آں ـــــ جی ـــــ نہیں، مس شاہینہ
سوچا کہ آپ جا رہی ہیں۔ ٹیلی فون پر
ملاقات ہو جائے ـــــــ"

"جی نہیں جناب ـــــ یہ خاکساری
تو ہماری توقع کے خلاف ہے ـــ"
مس شاہینہ نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔

"اچھا تو آج میں آ رہا ہوں ـــــ دیکھئے
اتنی اچھی غزل نہ سنائیے گا کہ پیرو مرشد
کے ہاتھوں سے تسبیح گر جائے۔"

"جناب ـــــ یہ تو آواز کا جادو ہے
میرے کا جگر پانی بن کر بہہ نکلتا ہے۔
موسیقی، نغمگی، زمزمہ یہ سب فطرت
کی وہ سحر طرازیاں ہیں، جن کے بغیر جمالیات
اور آرٹ کا کوئی شعبہ مکمل نہیں ہوتا۔

شعر نغمگی کا دوسرا نام ہے، اور نغمگی کے
لیے آواز درکار ہے ۔"

اسلم صاحب اتنی کیف انگیز باتیں سن کر مدہوش سے ہونے لگے ۔
"واہ مس شاہینہ ــــ آپ کی آواز تو ساز کے بغیر بھی نغمگی کی حامل ہے۔
کیا خوب کہا ہے کسی نے ــ

اس بغیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

شاہینہ نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر بولی ۔
"دیکھیئے آواز کا جادو کس طرح سر چڑھ کر
بول رہا ہے۔ آپ تو شعر پڑھنے لگے حالانکہ
آپ کے منہ سے نثر بھی مشکل ہی سے
سنی جا سکتی ہے ۔"
"خیر مس شاہینہ۔ آپ مذاق اڑا لیجیئے
ہم تو واقعی آواز کے تاثر اور جادو کے
قائل ہو گئے ہیں ۔ بس شام کو آ رہے
ہیں ــــ اچھا بھئی"

اسلم صاحب نے ریسیور رکھ دیا ۔ اتنے مسرور ہوئے کہ انہیں یہ بھی

احساس نہیں ہؤا کہ ان کی سکریٹری ان کے ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوئی اس کی منتظر ہے کہ وہ نظر اُٹھائیں۔

الف لیلہ کا تمام ہال کھچا کھچ بھرا ہؤا تھا۔ مس شاہینہ کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ اسلم صاحب سوچ رہے تھے، عشق کا احساس زندگی کے تمام محسوسات سے قطعًا بلند ہے۔ یہ عمر یا وقت کا پابند نہیں۔ یہاں اضافت کا کوئی فلسفہ خواہ کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو، اس منزل پر پہنچ کر پانی پانی ہوجاتا ہے۔

اسلم صاحب کے دل میں تمنا کا چور تھا، اور وہ اسے خود اپنے آپ سے چھپانے کے لیے طرح طرح کے استدلال تلاش کر رہے تھے۔۔۔۔ تہذیب۔۔۔۔ اخلاق۔۔۔۔ نہیں یہ سب قدریں جاہل عوام کے لیے ہیں۔ عشق تو نیکی اور خیر کا سمبل ہے۔ اس تاریک سیارے پر ۔۔۔۔خلافت جس حیوان ناطق کو میسر آئی ہے، وہ عاقل، دانا اور ادراک کا مالک ہے۔ اور اس کی عظمت عشق کے احساس میں پوشیدہ ہے مجھے شاہینہ تو کیا دنیا کی ہر عورت سے عشق کرنے کا حق ہے، اور جنس

یا فطرت کی پکار۔ یہ تو جسم کا وہ اتحاد ہے، جس کی تکمیل کے لیے ابتدائے آفرینش سے انسان جنگل جنگل مارا مارا پھرا۔ یہ وہی جستجو ہے، جس نے اُسے تہذیب کے آغوش میں لا ڈالا۔ یہ وہی جذبہ ہے، جس نے زندگی کی مانگ سنوارنے والے فن کار پیدا کئے۔ پھر میں شاہینہ سے عشق کیوں نہ کروں۔ یا اس سے یا اس کی آواز سے مجھے محبت کیوں نہ ہو۔

اسلم صاحب نے اپنے دل کے چور پر کتنے فلسفوں کا پیکر چڑھا دیا اب خود انھیں بھی وہ چور نظر نہیں آ رہا تھا۔

شاہینہ پیانو پر آچکی تھی۔ تالیوں سے استقبال......کے بعد اب نغموں کی برسات ہوگی۔

پیانو سے ایک ساز بلند ہوا۔ اور ساتھ ہی چاندنی میں نہائی ہوئی نقرئی آواز سے شاہینہ نے غزل چھیڑی۔

نگہہ شوق کی عادت ہے کہ اک اک سے کہے
راز دل کا کبھی پوشیدہ رہا ہے نہ رہے
دل کو اب ترک تمنا پہ کریں گے راضی
یوں شب و روز محبت کے ستم کون سہے
آہ! مضطرب، یہ ترا دھیمے سروں میں گانا!
جیسے دریا شب مہتاب میں آہستہ بہے

شعر بھی عجب علکس ہے، زندگی کے جس رنگ پر اس کا اثر پڑتا ہے اسی رنگ میں، اس کی تعبیر نکھر آتی ہے۔ آج اسلم صاحب گذشتہ پروگرام کی طرح خود کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپانے کی کوشش نہیں کر رہے تھے، بلکہ ایک ایک مصرع پر کچھ اس طرح مچل رہے تھے، جیسے ماہ و سال کے دریا میں بہتے ہوئے وہ اپنی ابتدائی جوانی کی منزلوں میں پہنچ گئے ہوں، جہاں کوئی خارشہ نہ تھا؛ سماجی قدروں کا کوئی احساس نہ تھا۔ ایک تڑپ تھی۔ ایک شدت تھی اور بس۔ وہ غزل کے اشعار میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہے تھے۔

تالیوں کے شور نے انھیں احساس دلایا کہ غزل ختم ہو گئی ہال سے اٹھ کر وہ اسٹیج کے پیچھے چلے گئے تاکہ شاہینہ سے جی بھر کر ملاقات کر سکیں۔

شاہینہ کافی دیر تک لوگوں کے ہجوم میں گھری رہی، اسلم صاحب اسٹیج کے پیچھے اس کا انتظار کرتے رہے۔ کلب کے ملازمین نے کئی بار آتے جاتے انھیں غور سے دیکھا، لیکن انھیں بالکل احساس نہ ہوا اور وہ اپنی تمام تر محویت کے ساتھ شاہینہ کی آواز اپنے کانوں کے قریب محسوس کرتے رہے۔

کافی دیر کے بعد شاہینہ دور سے آتی ہوئی نظر آئی۔ اسلم صاحب کی خواہش تھی کہ وہ بالکل تنہا ہو، اور وہ واقعی بالکل تنہا تھی مسکراتی ہوئی،

تمام تر ناز و ادا کے ساتھ ایک مشاق نگہہ باز عورت کی طرح وہ اسلم صاحب کے قریب آ رہی تھی۔

"معاف کیجئے مجھے دیر ہو گئی ـــــ میں نے اس طرف آتے ہوئے آپ کو دیکھا تھا، اور مجھے یقین تھا کہ آپ اسی جگہ کھڑے ہوئے میرا انتظار کر رہے ہو رہے گے۔"

"ہاں دیکھئے ـــــ کتنا عجیب اتفاق ہے۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ آپ اپنے پرستاروں سے فارغ ہو کر اسی راستے سے میرے پاس آئیں گی۔"

اسلم صاحب نے بے اختیارانہ شاہینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دونوں کلب سے باہر آ گئے۔

"آیئے میں آپ کو اپنی کار میں آپ کے ہوٹل چھوڑ آتا ہوں ـــــ"

"ہوٹل ـــــــ وہاں تو روز ہی جاتی ہوں۔ کچھ دیر آپ کے ساتھ رہوں ـــــ تو ـــــ تو آپ کو اعتراض ہے"

"آں ـــــ ہاں ـــــ جناب، اعتراض کیسا یہ تو میری خوش قسمتی ہے۔"

اب اسلم صاحب اپنی کار میں بیٹھ چکے تھے۔ شاہینہ ان کے قریب تھی۔ اور شہر سے باہر جانے والی سڑک، کی جانب بڑھ رہی تھی۔

"اس روز کرسمس کے بعد سے تو آپ آئے ہی نہیں۔ کیا بات تھی؟"

"کچھ نہیں ـــــ کاروباری مصروفیات اور پھر بچوں کی تنہائی۔"

"جی ـــــ بچوں کی تنہائی۔؟"

اسلم صاحب نے بچوں کا ذکر غیر ارادی طور پر کر دیا، حالانکہ وہ یہ ذکر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ شاہینہ کے اس سوال پر کچھ چونک پڑے اور انہیں اپنے متعلق بتانا ہی پڑا۔

"جی ہاں ـــــ تین بچے ہیں ـــــ ان کی ماں بیچاری مر چکی ہے۔ اب مجھے ہی ان کا سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

"کیا دودھ بھی آپ ہی پلاتے ہیں بچوں کو ـــــ"

"جی ہاں ـــــ بوتل سے ـــــ"

گفتگو اب قہقہوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اسلم صاحب اپنے سینے میں ایسی مسرتیں مچلی ہوئی محسوس کر رہے تھے، جن سے انسان کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ جب پہلی بار کسی لڑکی کی قربت کے احساس سے ایک نیا نیا عاشق، آشنا ہوتا ہے تو اسے ایسی ہی مسرت ہوتی ہے۔

اسلم صاحب شاہینہ سے اس مسرت انگیز لمحات میں بہت کچھ کہنے کے لیے بیتاب نظر آ رہے تھے۔ لیکن گفتگو جو بھی شروع ہوتی وہ دو چار جملوں تک جاری رہتی۔ پھر یا تو سلسلۂ گفتگو ختم ہو جاتا یا قہقہہ بلند ہوتا۔

اب کی بار انھوں نے بڑی کوشش سے گفتگو شروع کی۔

"مس شاہینہ دیکھئے، چاندنی کس طرح خاموشی کے ناہموار غاروں میں اپنی بے زبان موسیقی کو دفن کر دیتی ہے۔ یہ دور تک پھیلی ہوئی چاندنی، اس کی تعریف ایسے لمحات میں لوگ صدیوں سے کرتے آئے ہیں، لیکن مجھے تو آج یہ بالکل نئی معلوم ہو رہی ہے، جیسے چاندنی گنگنا رہی ہو۔ خاموشی کا گیت، وقت کا سب سے زیادہ دھیما اور طویل گیت۔ اس چاندنی کی آغوش میں کتنی بار تمنائیں، ہم آغوش ہوئی ہیں ہزاروں برس سے انسان اس کی لطیف ٹھنڈک میں بیٹھ کر اپنے محبوب کو دیکھتا رہا ہے۔ چاندنی کے سینے میں کتنے راز ہیں۔ اور آج شاید یہ ایک نئی کہانی سن رہی ہے۔ اور کسی نئی کہانی کے کرداروں کو پہچان رہی ہے۔"

اسلم صاحب نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی تھی اور دھیمے سروں میں انہوں نے یہ باتیں کچھ اس طرح کہیں کہ شاہینہ بھی ایک کیف میں ڈوب گئی۔ شاہینہ کی پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ وہ کسمسانے لگی۔ اس کسمساہٹ کو اسلم صاحب بھی محسوس کر رہے تھے۔ اور اب ان کے خون کی روانی بھی تیز ہونے لگی تھی۔

نرم گرم دلوں کی رات تھی۔ ایسی رات میں شہر کے باہر کی ان سڑکوں پر ٹریفک بالکل نہیں ہوتا۔ اسلم صاحب کافی دور نکل آئے تھے۔ کوئی منزل ان

کے سامنے نہ تھی۔ پیچھے شہر تھا، جہاں ان کے ذہن سے چور نکل کر سامنے آ جاتا، اور آگے ایک طول طویل سڑک تھی، تنہا اور خاموش۔ جس پر کوئی نگہبان نہ تھا۔ اور اسلم صاحب اس سڑک پر بہت دور نکل جانا چاہتے تھے۔

شاہینہ نے محسوس کیا کہ ہم شہر سے بہت دور نکل آئے ہیں اس نے اسلم صاحب کو ٹھوکا دیا۔

"اس کیف و مستی کے عالم میں آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم کتنی دور نکل آئے ہیں۔"

"میں تو اس سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا ہوں اتنی دور جہاں اس شہر کی کوئی نگاہ۔ ہمارا تعاقب نہ کر سکے۔"

"کیا شہر سے آپ اس قدر ڈرتے ہیں؟"

"شہر سے نہیں شہر میں پھیل جانے والی افواہوں سے"

"میں سمجھ رہی تھی آپ مجھے اپنی کوٹھی پر لے جائیں گے یا پھر کسی ہوٹل میں۔"

"ہاں ہونا تو یہی چاہیئے تھا۔"

"مگر ——— ؟"

"میں آپ سے ——— نہیں میرا دل آپ سے کوئی ایسی بات کہنا چاہتا تھا، جس کی گواہی اس ویران جگہ کے ذرات بھی دے سکیں۔"

"کیا ذرات کو گواہ بنانا چاہتے ہیں آپ۔؟"

"جی ہاں"

"مگر ہم نے تو گواہی کے لیے مشہور نام مخمل کی آغوش کا سنا ہے۔"

اسلم صاحب اس جملہ کے معنی تخلیق بھی نہ کر پائے تھے کہ شاہینہ نے اپنے بازوان کی گردن میں ڈال دئے اور اپنے ہونٹ ان کے سرد لیکن لرزتے ہوئے ہونٹوں پر رکھ دئے

گناہ کی وادی کے دروازے تک پہنچ کر اسلم صاحب کی دوسری شخصیت جاگ اُٹھی۔ انہیں ابتدائے جوانی کی اپنی وہ محبوبہ یاد آئی جس سے انھوں نے بالکل ابتدا میں پہلی بار محبت کی تھی، اور ایک شام اس نے بھی اسی طرح اپنے ہونٹ ان کے ہونٹوں سے پیوست کر دئے تھے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ بعد انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ یہ وارفتگی ان کی شخصیت سے زیادہ ان کی دولت کے سبب ہے۔ اس وقت بھی انھیں یہی احساس ہوا۔ شاہینہ اپنے لب و لہجہ کو جذباتی بنا رہی تھی۔

"ڈارلنگ ———— چاند اور چاندنی کی باتیں کر کے تم نے کیسے جذبات بیدار کر دیئے۔ کیا ہمیشہ کے لیے مجھے اس کیف بار جذبہ سے ہمکنار دیکھنا پسند کروگے۔؟"

اسلم صاحب اپنا جسم بچا رہے تھے۔ نگاہیں ماضی، حال اور مستقبل کو کرید رہی تھیں، دماغ خود انھیں اپنے آپ پر ملامت کرنے کے لیے اکسا رہا تھا۔

"ہم نے بہت بُرا کیا شاہینہ ۔ اگر کلب سے اس طرح ہمیں آتے ہوئے
لوگوں نے دیکھ لیا ہوگا۔ تو کل یہ واقعہ میرے تمام حلقے میں سنا جائے گا۔
میری سلمیٰ تک یہ بات پہنچے گی، اور وہ مجھ سے پوچھے گی —— پاپا، کیا
کلب کی بدتمیزی آپ پر اثرانداز نہیں ہوتی ۔"

"ہوں —— آگ لگا کر اب تماشا دیکھنا چاہتے ہیں آپ کیوں مذاق
بنا رہے ہیں، اس حسین اور رومان پرور لمحہ کو ۔"

"لمحہ دنیا کی سب سے قیمتی شے ہے ۔ مس شاہینہ اسے یوں برباد نہ کیجئے ۔"

"ایک ایک لمحہ کو خوب جی بھر کر استعمال کیجئے اسلم صاحب ورنہ یہ لمحات
آپ سے انتقام لے سکتے ہیں ۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں ۔"

"جی نہیں آپ نے وقت کے فلسفہ کو غلط سمجھا ہے۔ اسلم صاحب
پرانے زمانے میں جب روم کی تہذیب عروج پر تھی۔ وہاں ہر شام کلبوں میں
ایک بہت بڑا اجتماع ہوتا تھا، لوگ جام و شراب اور رقص و سرود میں اس قدر
محو ہو جاتے کہ ان میں وقت اور لمحے کا احساس باقی نہ رہتا اور انتہائی کیف و
مستی کے عالم میں، نصف شب کے قریب ان سب کے سامنے سے ایک
انتہائی بھیانک ممی گذاری جاتی، تاکہ اسے دیکھ کر وہ اپنے مستقبل کا اندازہ کریں۔
تب کیف و مستی سے سرشار، وہ لوگ سوچتے تھے، زندگی کا انجام

کتنا بھیانک ہے، ہمیں ہر لمحہ کو، ایک ایک لمحہ کو خوب استعمال کرنا چاہیئے۔ اور جام تیزی کے ساتھ انڈیلے جاتے، رقص و نغمہ کی رفتار تیز ہو جاتی اور انسان لمحات سے اپنے مستقبل کی دردناک ا۔ سفاکی کا انتقام لیتا۔"

اسلم صاحب نے بات کاٹ کر کہنا شروع کیا۔

"اور ان میں سے وہ جو دماغ کی فکر انگیز نگاہوں سے اس منظر کو دیکھتے، اس محفل سے اُٹھ کر چلے آتے، کیوں کہ انھیں اس کا احساس ہو جاتا کہ زندگی کا انجام اس قدر بھیانک ہے، اس لیے نعمت حاصلہ میں انھیں جو چند لمحات میسّر ہیں، ان میں وہ کچھ ایسے کام کر جائیں کہ ان کی خوفناک اور بھیانک لاش پر ان کے نیک اعمال کی چادر پڑ جائے اور آئندہ آنے والی نسلیں ان کی ممی سے خوفزدہ نہ ہوں، ان سے نفرت نہ کریں اور ان کی ممی نیکی اور حسن کا سمبل بن کر ہمیشہ زندہ رہے۔"

اسلم صاحب کا لہجہ تلخ ہو چکا تھا۔ اندر ہی اندر وہ سوچ رہے تھے کہ یہ جو گناہ سرزد ہوا ہے، اس کا کفارہ کیوں کر ادا کروں گا۔ اگر یہ خبا(ثت) ی اور میرے بچوں تک پہنچی تو وہ میرے کردار کے متعلق کیا اندازہ لگائیں گے۔

انھوں نے گاڑی کو شہر کی جانب موڑ دیا۔ آتے وقت ان کے ذہن میں ایک طوفان تھا، لیکن اس کا رخ کسی اور سمت تھا۔ اور اب بھی ان کے ذہن میں ایک طوفان تھا، لیکن اس کا رخ کسی اور جانب تھا۔ پہلے طوفان کے بالکل متضاد۔

آتے وقت گاڑی کی رفتار آہستہ تھی، اور اب انتہائی تیز ــــــ وہ جلد سے جلد شاہینہ سے خود کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ شہر قریب آرہا تھا ان کے دل کا چور اب انھیں اپنے سامنے شیشہ پر صاف نظر آرہا تھا۔

شاہینہ پیلس ہوٹل میں قیام پذیر تھی اور پیلس ہوٹل آگیا تھا۔ شاہینہ نے محسوس کیا کہ شکار نکلا جارہا ہے۔ آخری بار کوشش کر دیکھیں۔ پیلس ہوٹل کے برآمدے میں موٹر رکی، لیکن شاہینہ موٹر سے نہیں اتری۔

"آپ کیا واپس چلے جائیے گا؟ ــــــ اپنی کوٹھی پر تو آپ کو بچوں سے ڈر لگتا ہے۔ یہاں پر ہوٹل میں تو آپ کو نہیں ڈرنا چاہیئے ــــــ آیئے نا ــــــ آؤ نا ڈارلنگ"

"مس شاہینہ مجھے بلڈ پریشر کی شکایت ہے اور اس وقت میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ پھر دوسری بار آؤں گا ــــــ ضرور آؤں گا ــــــ اب تو ــــــ"

"جی ــــــ نہیں۔" شاہینہ نے ٹھنک کر کہا۔ "میں نہیں جانے دوں گی آپ کو۔"

"نہیں شاہینہ ــــــ مجھے معاف کر دو ــــــ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو کبھی کبھی اپنی کسی محرومی کے سبب خود اپنے آپ سے عیاری کرتے ہیں، ٹیلی فون پر تم سے جو گفتگو ہوئی، وہ بھی عیاری تھی اور

اب جب میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر شہر سے دور چلا گیا نا۔ یہ بھی ایک عیاری تھی اپنے ضمیر اور اپنے ذہن سے۔"

"معاف کیجئے ــــ میں آپ جیسے سرمایہ داروں کا کھلونا نہیں ہوں اسلم صاحب ــــ آپ کا جب دل چاہے، مجھے اپنا دل بہلانے کے لیے استعمال کریں اور جب دل چاہے توڑ پھینکیں ــــ آپ کو میرے اس ــــ ایمان ــــ کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔"

شاہینہ کو آئے دن ایسے لوگوں سے سروکار رہتا تھا تجربہ کار تھی۔ اسلم صاحب کے اندر چھپے ہوئے اس آدمی کو پہچان گئی، جسے ناکردہ گناہوں کی حسرت پریشان کیے ہوئے ہے۔ اس نے سوچا کہ جب شکار ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے تو کچھ نہ کچھ ــــ بھاگتے کی لنگوٹی ہی سہی ــــ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اسلم صاحب نے اپنے کوٹ کے اندر کی جیب سے ہاتھ نکالا اور سو سو روپے کے دس نوٹ شاہینہ کی گود میں ڈال دیئے۔

شاہینہ نے اسلم صاحب کے چہرے کو بغور دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں محرومی اور ناکامی کے دھندلے سائے صاف نظر آ رہے تھے ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں ــــ مجھے معاف کر دو ــــ میں گناہ کی آرزو کر سکتا ہوں لیکن گُناہ نہیں کر سکتا۔ میرے اندر ایک انسان چھپا ہوا ہے پاکیزہ انسان، ایک باپ، یتیم بچوں کا، ایک انسان، لیکن انسانی

قندوں سے آراستہ ۔ مجھے جانے دو۔

شاہینہ نے نوٹ اٹھائے اور حقارت آمیز نگاہیں اسلم صاحب کے چہرے پر ڈالتی ہوئی طنزیہ قہقہہ کے ساتھ موڑ سے اتر گئی۔

اسلم صاحب بیس ہوٹل سے باہر نکل آئے ۔ ان کی کار شہر کی مختلف سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ اسلم صاحب کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ مجھے، مجھ جیسے انسانوں کو اپنے سائے سے اپنی اولاد کو محفوظ رکھنا چاہیئے میرا کردار برا ہے۔ میں اپنے نفس کے آگے سب کچھ بھول جاتا ہوں۔

شہر کی مختلف سڑکوں پر کافی دیر تک بے سبب چکر لگا کر اب وہ اپنی کوٹھی کے زنانخانے میں داخل ہو گئے تھے۔ کار کو انتہائی احتیاط کے ساتھ خاموشی سے بائیں بازو کی جانب کھڑا کیا اور دبے قدموں سے وہ اندر داخل ہوئے۔

ڈرائنگ روم سے روشنی نظر آرہی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ سلمیٰ ابھی تک مطالعہ کر رہی ہے۔ آہستگی کے ساتھ وہ ڈرائنگ روم کے دروازے

کے سامنے سے گزر جانا چاہتے تھے کھلے ہوئے دروازے سے انھوں نے دیکھا ڈرائنگ روم میں سلمیٰ اکیلی نہیں تھی۔ بلکہ قریب کی کوٹھی میں رہنے والا ایک نوجوان لڑکا بھی تھا۔ وہ سلمیٰ کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر رہا تھا۔ اور سلمیٰ انتہائی وارفتگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ دروازے کے قریب کھڑے رہ کر اسلم صاحب نے دو منٹ تک یہ منظر دیکھا لیکن سلمیٰ اور اس کے ساتھی نوجوان کو بالکل خبر نہ ہوئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔

اس منظر نے اسلم صاحب پر وہ اثر کیا جو برسات کے دنوں میں چمکنے والی بجلی کسی خوف زدہ مسافر کے قریب گر کر کرتی ہے۔ انھوں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ خشک ہو جانے والے ہونٹوں اور گلے میں لعاب کو گردش دیکر آسانی سے سانس لینے کی کیفیت پیدا کی اور انتہائی خاموشی سے وہ آگے بڑھ گئے۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ صوفہ سیٹ پر گر پڑے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر سنبھالا۔ اچانک ان کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا کہ زور سے سلمیٰ کو آواز دیں۔ لیکن انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے دل و دماغ سے نکل کر کسی ماورائی قوت کی روح نے ان کا گلا دبا دیا ہے۔ اور ان سے بولا نہیں جا رہا ہے اور وہ قوت ان سے پوچھ رہی ہے، کہ ابھی

قربت کی خواہش تو تم بھی کرتے رہے ہو۔ جو تم چاہتے ہو، کیا وہ اپنی اولاد کے لئے نہیں چاہتے۔ کیا محبت گناہ ہے۔۔۔ محبت نیکی کا سمبل ہے۔ نہیں — محبت جنس کی لیک اور اس راہ کی پہلی منزل ہے — نہیں یہ سب بُرا ہے۔ تم خود مجرم ہو — نہیں تم غلط ہو — تم زندگی اور فطرت کے تقاضے نہیں سمجھتے — محبت، عشق، جنوں — یہ تو شخصیت کی تکمیل کے مراحل ہیں۔ انسان — ہر ذہین انسان اپنی شخصیت کی تکمیل چاہتا ہے — اسی لئے تو وہ محبت کرتا ہے۔ سلمیٰ کو بھی اس کی شخصیت کے تکمیلی عناصر تلاش کرنے دو تاکہ وہ کامیاب ہو — ایک انسان اسی طرح روحانی کامیابی حاصل کرتا ہے۔

اسلم صاحب کو اپنے دماغ میں آوازوں کا ایک شور محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے فطرت، یا ان کے اندر چھپا ہوا ایک اور انسان اور خود ان کی شخصیت یہ سب کسی جنگ میں مبتلا ہیں۔

اسلم صاحب نے محسوس کیا، جیسے وہ دلائل اپنے حریفوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ نہیں یہ سب غلط ہے تہذیب، جس کے ارتقاء کی خاطر انسان صدیوں سے فطرت سے لڑتا رہا، اخلاق، جس کی تکمیل کے لیے عیسیٰ کو صلیب پر لٹکایا گیا، روح کی پاکیزگی، جس کی تلاش میں بدھا چالیس برس تک سرگرداں رہا — یہ سب انسانیت کے اصل اوصاف

ہیں، اور محبت یا عشق، یا جنس کی آسودگی، یہ سب جنس کی حیوانی جبلتیں ہیں۔

"تو پھر تم خود ان جبلتوں کی طلب پر ابھی چند لمحات پیشتر کیوں بہے جارہے تھے۔ اس منزل سے گزر کر بھی تم نے اس منزل کو، اور اس کے مکینوں کو، ان کے احساسات کو نہیں پہچانا۔"

اڑا ـــــ اڑا ـــــ دھم ـــــ اسلم صاحب نے قریب ہی اسٹینڈ پر رکھا ہوا، گلدان بے خبری کے عالم میں اپنے اوپر گرا لیا "کون ـــــ کون ہے ڈیڈی کے کمرے میں؟"

"آپا ـــــ یہاں آؤ ـــــ"

یہ سلمیٰ کی آواز تھی، اس کے قدموں کی چاپ اسلم صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور ایک دوسری چاپ کوٹھی کے باہر لال بجری کے راستے پر دور ہوتی ہوئی صاف نظر آرہی تھی۔

آپا اسلم صاحب کے چہرے پہ پانی کے چھینٹے دے رہی تھی سلمیٰ

اسلم صاحب کے سرہانے بیٹھی تھی ساس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ انور اور نجمی بھی شور سن کر اٹھ بیٹھے تھے، اور اسلم صاحب کے قریب بیٹھے ہوئے معصومیّت سے انھیں دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اسلم صاحب کو ہوش آیا۔ سب کے چہروں سے پریشانی دور ہوتی نظر آئی۔

"ڈیڈی ——— کیا ہوگیا تھا آپ کو، اور آپ کب آئے؟ ——— ہمیں تو پتہ بھی نہیں ———"

اسلم صاحب اپنے آنے کا وقت بتانا نہیں چاہتے تھے مسکرا کر سب کو رخصت کیا ——— ان کے ذہن میں آوازوں کا جو طوفان تھوڑی دیر پیشتر جاری تھا، اب اس کا کوئی نقش باقی نہ تھا سلمیٰ کو انھوں نے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور دونوں بچّوں کو آیا کے ساتھ دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

سلمیٰ کچھ گھبرائی ہوئی تھی ——— اس کا چہرہ زرد پڑتا جارہا تھا۔

اسلم صاحب نے اسے غور سے دیکھا۔ پھر خاموش ہوگئے کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔

"بیٹی انسان کی فطرت قدرت نے بہت عجیب بنائی ہے۔ یہ آگ کا بھی اسی قدر خواہش مند ہے، جتنا پانی کا۔ اسے شراب کی بدبو بھی اتنی

ہی بھاتی ہے، جتنی گلاب کی خوشبو ــــــ انسان اپنی فطرت، اپنی جبلت اور انسانی اعلیٰ قدروں کے درمیان اس طرح لٹکا ہوا ہے، جیسے اس کے دو جانب مقناطیس ہو، اور ہر سمت کی کشش اسے اپنی جانب کھینچتی ہو۔ میں اور تم، ہم سب روئے زمین کا ہر انسان، اسی کش مکش کا شکار ہے۔ اور ہم سے وہ جو دائیں جانب کی کشش سے وابستہ ہو جائے۔ اور دائیں جانب کی کشش سے خود کو آزاد کرے وہ کوئی بڑا مفکر، فلسفی، یا ــــــ ایک خاص قسم کا آدمی بنتا ہے۔ جب تک انسان ان دونوں کششوں کے درمیان رہتا ہے۔ اس کی شخصیت اس سے جنگ کرتی رہتی ہے۔ اور ہم اسے کامیاب انسان نہیں کہہ سکتے۔ لیکن، ہاں وہ انسانی جبلت کا صحیح اور صادق نمونہ اسی درمیانی حیثیت میں ہوتا ہے اور دائیں جانب کی کشش جو ہے وہ زیادہ عظیم بنا دیتی ہے، انسان کو ــ اس جانب وہ نہ صرف اپنی شخصیت پر، بلکہ اپنے انسان پر فتح پا لیتا ہے، اور دوسری جانب، وہ صرف اپنی شخصیت پر فتح پاتا ہے۔

تم ابھی ناسمجھ ہو۔ تمہیں نوجوان لڑکوں کے ساتھ ابھی اتنی آزادی سے، اتنی رات تک یوں نہیں رہنا چاہیئے۔

جاؤ ــ اب سو جاؤ۔ اس گفتگو کو بھول مت جانا۔"

سلمٰی اٹھ کر چلی گئی۔ اسلم صاحب نے یہ باتیں کیں لیکن سلمٰی کی جانب ایک بار بھی نہ دیکھا۔ سلمٰی خود بھی ان سے آنکھیں دو چار نہیں کرنا چاہتی تھی اور اسلم صاحب خود بھی گریز کر رہے تھے۔

اس رات اسلم صاحب نے ایک خواب دیکھا جیسے انھیں عیسٰی مسیح بنایا جا رہا ہے۔ ان کی لٹیں شانوں پر پڑی ہیں لمبی داڑھی ہے اور جنگل میں لوگوں کا ایک جم غفیر ہے جو ایک عورت کے تعاقب میں بھاگ رہا ہے وہ عورت ان کے قریب آتی ہے تو انھیں معلوم ہوتا ہے یہ سلمٰی ہے اور لوگ اسے سنگسار کرنا چاہتے ہیں، وہ سلمٰی کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں:۔

"تم میں سے وہ جس نے کبھی عورت کی جانب بری نگاہ سے نہ دیکھا ہو، اسے پہلا پتھر مارے۔"

پھر تمام لوگ، جن کے ہاتھوں میں پتھر تھے، اپنا اپنا پتھر پھینک دیتے ہیں ــــ پھر جم غفیر واپس چلا جاتا ہے۔ سلمٰی بھی واپس چلی جاتی ہے ــــ اور اسلم صاحب دوسری جانب اپنا منہ موڑتے

ہیں — اور چپکے سے اپنے ہاتھ کی آستین میں چھپا ہوا ایک پتھر
دور پھینک دیتے ہیں۔

اسلم صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ کھڑکیوں سے سورج کی پہلی کرنیں
کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ نجمی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ انہوں
نے دروازہ کھولا۔

"ڈیڈی ——— یہ آپا بہت بری ہے۔ میرے اسکول کے کپڑوں
پر چائے گرا دی آپ ہمارے لئے ممی کب لائیں گے —؟"

اسلم صاحب نے نجمی کو گود میں اٹھالیا۔

ہاں — ہاں بیٹا آج ہی ہم اخبار میں اشتہار دیتے ہیں — تمہارے لئے
ممی جیسی ایک گورنس بلاتے ہیں۔

آج کی صبح اسلم صاحب کو بالکل نئی معلوم ہو رہی تھی جیسے کل کا
واقعہ اور رات کا خواب ان کے احساس پر چڑھی ہوئی دبیز تہہ کو
چیر پھاڑ کر پھینک گیا ہے۔ وہ ایسا محسوس کر رہے تھے، جیسے وہ
ابھی پیدا ہوئے ہیں۔ بالکل انجان، پاکیزہ بچے کی طرح۔ حسب معمول
اسلم صاحب دفتر جانے کے لئے تیار ہوئے۔ منہ دھو کر جب وہ
آئینہ کے روبرو کھڑے ہوئے تو انہیں اپنی آنکھوں اور اپنے چہرے
پر بلا کی معصومیت معلوم ہوئی۔

دفتر پہنچنے میں اسلم صاحب کو معمولی سی تاخیر ہو گئی تھی بہت سے ملاقاتی ان کے دفتر پہنچنے سے پہلے ہی آ گئے تھے۔ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی انھوں نے اپنی سکریٹری کو بلایا۔ "سکریٹری ــ کل کے تمام خطوط ٹائپ ہو گئے؟ اسلم صاحب نے اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"سر ــــ رات شہر سے باہر جانیوالی سڑک پر ایک لڑکی کے ساتھ

" سکریٹری ابھی جملہ پورا بھی نہ کر پائی تھی کہ اسلم صاحب نے زور سے کہا۔

"شٹ، اپ۔ میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو"

اسلم صاحب کی آنکھیں سکریٹری کا یہ ادھورا جملہ سن کر لال ہو گئیں اور ان کا دل دھڑکنے لگا، جیسے انہیں چوری کرتے ہوئے اسی ظالم سکریٹری نے پکڑ لیا ہو۔

"سر۔ آپ ہی کے سوال کا تو جواب دے رہی ہوں ہمارا اسٹینو شہر سے باہر جانے والی سڑک پر ایک لڑکی کے ساتھ آوارہ گردی کرتے ہوئے پکڑا گیا۔" سکریٹری نے جلدی سے جملہ پورا کیا۔ اسلم صاحب نے اپنی پیشانی پر رومال پھیرا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

(۲)

انگارے

نکہت ایک غریب گھرانے کی حساس لڑکی تھی۔ دو تین برس سے ملازمت کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ رہنمائے دکن میں گورنس کی ضرورت کا اشتہار پڑھ کر اُس نے اسلم صاحب کو درخواست نما خط بھیج دیا۔

خط کے طرزِ تحریر میں نکہت کی فطرت کی تمام تر سادگی اور وُہ تمام جذبانیت سما گئی تھی۔ جو اُسے ہمیشہ آہوئے ختن کی طرح بے آب و گیاہی کا احساس دلاتی تھی۔ زندگی کتنی ہی بیکار سے کیوں نہ ہو اُس کا احساس ہمیشہ لذتوں اور مسرتوں کا حامل رہا ہے۔ نکہت نے بھی اسی احساس کو خط کے مضمون میں سمو دیا تھا۔ نکہت کو یقین نہیں تھا کہ یہ نوکری اِسے مل جائے گی لیکن خلافِ توقع اُسے اسلم صاحب کے یہاں ملازمت مل گئی تھی۔

اسلم صاحب، دو جذباتی واقعات کے بعد سے بلکل ایسے ہو گئے تھے، جیسے وہ اب بلکل ضعیف ہو چکے ہیں، یا پھر وُہ نہ کبھی بچے رہے تھے اور نہ کبھی اُن پر جوانی آئی تھی۔ دُنیا کو پہلی بار جب انہوں نے پہچانا، تب بھی اُن کی یہی عمر تھی۔ گویا ابھی تک اُنہوں نے کبھی گناہ نہیں کیا، وُہ بلکل پاکیزہ ہیں۔ اُنہوں نے کبھی دُنیا سے لذت یاب ہونے کی خواہش نہیں کی، وہ بلکل نیک ہیں۔ ایک ہی جذباتی طوفان کے بعد اُن کے احساس کا سمندر اس طرح خاموش ہو گیا تھا، جیسے وُہ ایک سراب ہوں جس پر کبھی پانی کا شبہ ہوتا ہو۔

سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی ویران راتیں گزر گئیں۔ انہوں نے کبھی دریچہ کے قریب کھڑے ہو کر جوبلی ہِل کے سائے میں تلنگانہ کی تندرست اور موٹے بدن والی سیاہ عورتوں کی بابت نہیں سوچا۔

پھر موسم بدلا، اور تلنگانہ کی وُہ بے پناہ کشش رکھنے والی عورتیں اپنی جھونپڑیوں کے باہر سونے لگیں۔ اِس موسم کی چاندنی راتوں میں تو اسلم صاحب کی کوٹھی کے دریچوں سے اُن کے جسم کے سوئے ہوئے نقش صاف نظر آتے۔ لیکن اسلم صاحب نے پھر کبھی دریچہ میں کھڑے ہو کر نہیں دیکھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وُہ طوفان کبھی نہیں آئے گا، جس کی زد میں اسلم صاحب کی تہذیب، شرافت اور اخلاق کے خس و خاشاک

بہہ جاتے تھے۔ لیکن اسلم صاحب کچھ بیمار رہنے لگے تھے جیسے اندر ہی اندر کوئی چیز پک رہی ہو سال کی بیماری اب تشویشناک ہوتی جارہی تھی۔

نکہت کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا ——— اسلم صاحب درد سے کراہتے پڑے تھے اور وہ خود باہر ہاتھ ملتی کھڑی تھی۔ اُس نے لپک کر شانو کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اُس کے کان میں بولی۔

"ڈاکٹر صاحب کا فون نمبر یاد ہے تمہیں"

"جی ہیں ——— ۹۴۳۴ ——— وہ حیرت سے بولی

کیوں مگر ——— ؟"

"تم جلدی سے جاکر ڈاکٹر صاحب کو فون کر دو کہ وہ اِسی وقت کوٹھی پر چلے آئیں "

شانو بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور نکہت دھیرے دھیرے کمرے میں داخل ہو گئی

اسلم صاحب نے ایک لمحے کو آنکھیں کھول کر نکہت کو آتا دیکھا اور پھر آنکھیں موند لیں۔

نکہت دھیرے دھیرے کمرے میں داخل ہو رہی تھی ——
دکتنے دِنوں پیچھے آج اسلم صاحب کا دماغ جاگ رہا تھا) لمبا سا قد ——
سانولا رنگ —— بھورے بالوں کی دو چار لٹیں پیشانی
پر آئی ہوئی —— اور وُہ آنکھیں —— اُس کے چہرے
پر کوئی چیز سب سے نمایاں تھی تو یہی آنکھیں —— بڑی بڑی
اور اِس قدر غم سے بھری، کہ لگتا تھا ابھی ابھی اِن میں آنسو امنڈ آئیں
گے —— ان آنکھوں کو دیکھ کر خواہ مخواہ اِن آنکھوں والی سے
ہمدردی کرنے کو جی چاہتا تھا —— نکہت کے سراپے کو دیکھتے
ہی اسلم صاحب کے دماغ میں اُس کا خط گھومنے لگا۔

محترمی

مَیں نے آج صبح کے اخبار میں آپ کا دیا ہُوا اشتہار پڑھا۔ آپ کو
اپنے بچّوں کیلئے ایک گورنس کی ضرورت ہے اور مجھے اپنے لئے اپنی ماں
اور اپنی ضروریات کیلئے ایک معقول رقم کی —— آپ نے یہ بھی بتا دیا
ہے کہ گورنس کی ماہانہ تنخواہ دو سو روپے ہوا کرے گی۔ مگر اُسے اپنی

ڈیوٹی انجام دینے میں بہت ہی اسمارٹ ہونا چاہیئے۔ (جس کیلئے ۲۸ سال سے اوپر ہونا بھی لازمی رکھ دیا ہے ———) مَیں اکثر سوچتی ہوں جناب خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا میں اتنی ناانصافی کیوں ہے۔ کس نے پیدا کی، ہم نے یا خود خدا نے —؟؟

دیکھیئے نا آپ محض اِتنے کام کے دو سو روپے خرچ کرنے کو تیار ہیں۔ کہ کوئی آپ کے بچوں کو کھلائے پلائے، کپڑے بدلوا دے اور ڈھنگ سے دیکھ ریکھ کرے —— ۔ جبکہ یہاں یہ حال ہے کہ ایک بار کھانا ہی مِل جانا معجزہ ہے۔

آپ کے پاس تو بُہت ساری درخواستیں آرہی ہوں گی اور اُن میں سے یقیناً آپ کسی نہ کسی کو چُن بھی لیں گے۔ مگر مَیں آپ سے اپنی مجبوریوں کا کیا بیان کروں ——— کاش میری عمر آج سے بیس سال زیادہ ہوتی ——— (دو سو روپے! خوبصورت جنّت!) میرا دِل چاہ رہا ہے کہ کسی بھی طرح آپ کے دِل میں اپنے لئے رحم بھر دوں اور یہ نوکری حاصل کرلوں ——— صبح سے جب سے آپ کا اِشتہار پڑھا ہے۔ مَیں نے اِتنی کم مُدت میں اس قدر رنگین خواب دیکھ ڈالے ہیں کہ پوچھیئے نہیں۔

صبح سے مَیں نے کئی ساڑیاں بدل ڈالی ہیں۔ کانوں کے ٹاپس نہیں

نیچے تو جھولتے ہوئے لمبے ایر رِنگ پہن لیے ــــــ گلے میں ہلکی سی زنجیر
پسند نہیں آ رہی تھی تو چمکدار نیکلس پہن لیا ــــــ چپل ناپسند
ہونے لگی تو اُونچی ایڑی کی سینڈل پہن ڈالی ــــــ کئی دنوں سے
جو گھڑی کا اسٹریپ بدلوانے کے بارے میں سوچ رہی تھی، فوراً ہی
بدل ڈالا ــــــ اب میری کلائی پر سنہرا اسٹریپ جھلمل کر رہا ہے۔
ــــــ مَیں نے اپنے کمرے میں رنگین پردے لٹکا لیے ہیں
ــــــ ہلکی نیلی مسہری کے سامنے کرسی اور میز دھری
ــــــ اور یہاں بیٹھ کر مَیں آپ کے تینوں بچّوں کو انگلش
پڑھا رہی ہوں۔

(جی ہاں مَیں بی۔اے پاس کر چکی ہوں۔)
بہت سی دعائیں اور محبتیں۔!

نیازمند

نکہت

اسلم صاحب کو خط لکھنے کا اسٹائل بڑی طرح بھا گیا۔
نوکری کیلئے کئی عرضیاں آئی رکھی تھیں، مگر اب وہ کسی کے بارے

میں نہیں سوچ رہے تھے۔ اِتنی معصومیت اِتنی سچائی، اتنی سادگی اور اپنی قدر منوانے والے لہجے اور انوکھے اسٹائل کی کوئی تحریر آج تک اُن کی نظر سے نہ گذری تھی۔

سیکرٹری نے جب سارے خطوط اُن کے سامنے ڈالے تھے تو انہوں نے نکہت کے خط کو الگ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"مس نکہت آئیں تو انہیں اپوائنٹمنٹ کر لینا"

"جناب ——— وہ رُکتے رُکتے بولی ——— وہ صرف بیس سال کی ہیں اور آپ نے تو چالیس . . . . . . ؟"

"بکو مت ———" اسلم صاحب جھلا کر بولے ——— جو کہا جائے اُسے پورا کیا کرو۔

نکہت آئی تو اسلم صاحب نے سرسری نگاہ سے اُسے دیکھا اور لاپرواہی سے بولے

"آپ کل سے کام پر آرہی ہیں ———؟"

اس اچانک اور غیر متوقع خوشی سے نکہت لڑکھڑا سی گئی اور رکتے جھجکتے بولی۔

"مگر جناب میں . . . . میں تو . . . ."

مَیں تو صرف بیس سال کی ہوں یہی کہہ رہی تھیں نا آپ ۔ وُہ ہنس کر بولے ـــــــ کوئی بات نہیں ـــــــ مجھے عمر کی قید اِس لئے لگانی پڑی تھی کہ گورنس تجربہ کار اور ذمہ دار ہو۔ مَیں نے پہلے تو آپ کا خط دیکھا اور اَب آپ کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں عمر ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔"

نکہت نے کچھ نہ کہا ـــــ کچھ بھی تو نہ کہا ـــــ بس اسلم صاحب کو دیکھا اور دیکھ کر آنکھیں جھکالیں۔

جب وُہ جانے کیلئے مڑی تو اسلم صاحب نے اُس کے پچھائیں کو دیکھا ـــــ اِتنی حسین جسامت ـــــ اِتنا ذہین دماغ اِتنی اچھی لڑکی ـــــ اور غریبی بھی کیا شے ہوتی ہے۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اُس نے اِس قدر اہتمام سے جو ساڑی پہنی ہے وُہ دو پیسے کا صابن لگا کر دھوئی ہوگی اور اِستری نہ کر سکی ہوگی تب ہی تو یوں ملگجی ملگجی دکھائی دے رہی تھی، جیسے پہلی پہلی برسات کے پیلے پیلے بادل

نکہت نے کمرے کو بار بار دیکھا ـــــ دیواروں کو دیکھا

میز کو دیکھا، کرسی کو دیکھا ——— پھر پلنگ اور مسہری کو، نیلی مسہری اور اسی سے میچ کرتے ہوئے نیلے چھپری دار رنگین پردے وہ اپنا بکس رکھ کر تیز تیز قدموں سے چلتی اسلم صاحب کے کمرے تک پہنچی اور دروازے پر دستک کر لی۔

"یس ——— میں اندر آ سکتی ہوں"

اسلم صاحب نے سر ہلا کر اُسے اندر آنے کی اجازت دی تو وہ آتے ہی بالکل بچوں کے سے معصوم لہجے میں جلدی جلدی بولنے لگی۔

"وہ آپ کے سیکرٹری صاحب میری بات سنتے نہیں ہیں۔ جانے کونسا کمرہ میرے لئے وقف کر دیا ہے۔ اب میں انہیں غلطی پر شرمندہ کرنا چاہتی ہوں تو ڈھٹائی سے بولتے ہیں کہ "نہیں وہ کمرہ میرا ہی ہے ——— بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے ——"

"اسلم صاحب ذرا سا مسکرا کر بولے

نکہت حیرت سے اُن کے منہ کو تکنے لگی تو وہ غم آمیز مسکراہٹ سے بولے

تم نے اپنے لئے خط میں کمرے کا جیسا نقشہ کھینچا تھا۔ ویسا ہی ہے یا نہیں؟"

(کس قدر مہربان ——— کتنا شفیق، کتنا اونچا ہے یہ انسان)

نکہت نے گھبرا کر کہا۔

"مگر جناب وہ تو میرا ایک ناممکن خواب تھا ــــــ زندگی کی سب سے بڑی اور سب سے ناقابلِ حصول تمنا تھی۔

وہ ــــــ وہ ...."

"اسلم صاحب اسی لہجے میں بولے ــــــ اب تمہارے خواب کی تعبیر تو تمہارے سامنے ہے ہی ــــــ کیا خدا کو اب بھی ناانصاف کہو گی ــ؟"

یقیناً یہ کوئی انسان نہیں دیوتا ہے ــــــ بھلا انسان اس قدر رحم دل، اتنے خلیق، اس قدر شفیق کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ شخص جو دیکھنے میں انسانوں جیسا ہی نظر آ رہا ہے ــــــ اس کے سینے میں کس کا دِل ہے۔ ــــــ؟ کل اُس نے مجھے آپ کہہ کر پکارا ــــــ آج تم کہہ رہا ہے اور اس قدر پیار و خلوص سے، کیا یہ حقیقت ہے یا سچ مچ میرا خواب ہی ہے ــــــ اُس نے چونک کر اپنے پاس کو دیکھا۔

"بوس ...." وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اسلم صاحب نے ہاتھ اُٹھا کر منع کر دیا۔

"مجھے بوس نہ کہو۔ اس لفظ سے مجھے دُکھ ہوتا ہے۔ ہم سب ایک ہی خدا کے پیدا کئے ہوئے انسان ہیں، کوئی چھوٹا نہیں، کوئی بڑا نہیں ــــــ ہمارا بوس تو وُہ ہے ــــــ اور انہوں نے اپنی انگلی (جس میں ہیرا

پکھراج چمک رہا تھا) آسمان کی طرف اُٹھائی ـــــــــ نکہت یونہی
تصویرِ حیرت بنی کھڑی تھی۔

وُہ سادگی سے بولے

"میرا نام اسلم ہے ـــــــ"

احسانوں کے بوجھ تلے دب کر نکہت خود ہی اتنی بوجھل ہوگئی کہ قدم تک نہ اُٹھا سکی۔ بڑی مشکل سے اُس نے ساری طاقت سمیٹ کر اپنے پیر ہلائے اور دھیرے دھیرے کمرے سے باہر نکل گئی۔

نکہت کی آنکھوں سے ایسے آنسو چھلک گئے جو انتہائی اپنائیت، اور کسی پاکیزہ مسرّت کے موقع پر ظاہر ہوتے ہیں۔

نکہت نے اچھی بُری نگاہیں دیکھی تھیں۔ نگاہوں کا تجربہ لڑکیوں کو خوب ہوتا ہے۔ خواہ وُہ سماج کی کسی سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہوں۔ راہ چلتے، یا کسی کے یہاں مہمان جانے پر یا کسی شادی بیاہ کے موقع پر، جب بلا ارادہ نگاہیں مردوں سے دوچار ہوتی ہیں۔ ایسی سینکڑوں نگاہوں کی کیفیت۔ لڑکیاں خوب جانتی اور سمجھتی ہیں۔

اسلم صاحب کی نگاہیں دو ایک بار ہی پوری طرح نکہت پر پڑی تھیں۔ لیکن اُس نے اپنے تمام تر گذشتہ تجربات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا تھا۔ کہ اسلم صاحب کی نگاہوں میں معصومیت ہے، ہوس نہیں ہے،

لیکن آواز کا ایک گوشہ ایسا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ وہ قربت چاہتے ہیں اور یہ خواہش کسی جنسی دباؤ کے سبب نہیں بلکہ انسانی احساسات کی پاکیزگی کے سبب ہے۔

جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو اُس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

اب اُس نے مالکانہ احساس کے ساتھ پھر سے اپنے کمرے کا جائزہ لیا ——— اُسے یہ دیکھ دیکھ کر بڑی طرح حیرت ہو رہی تھی کہ ہر ہر چیز بالکل ایسی ہی تھی جیسی کہ اُس نے تصور میں سوچ رکھی تھی اور خط میں جس کا ذکر کیا تھا ——— اسلم صاحب نے صرف ایک دن میں یہ سب کچھ کیسے کر لیا ——— کیوں کر لیا ——— یہاں سچ مچ کے رنگین پردے تھے ——— رولونگ چیئر تھی ——— اُس کے ساتھ ٹیبل ——— کھڑکی، باہر باغ میں کھلتی تھی ——— اور کھڑکی سے لگ کر گلابوں کے پودے تھے ——— ہوا کے ایک جھونکے نے خوشبوؤں کو اندر لوٹا دیا۔ اور نکہت پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔۔ اپنے جسم کو گھما کر جب وہ پیچھے دیکھ رہی تھی تو سامنے والی

دیوار میں اُسے ایک لڑکی کھڑی نظر آئی ——— اُس لڑکی کو اُس نے آج سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا ——— لمبے سے قد، سانولی رنگت والی بھورے بالوں اور نمناک آنکھوں والی وُہ لڑکی جو ایک ملگجی سی ساڑی میں ملبوس اور حیرت سے آئینے کو تک رہی تھی ——— اُس نے قریب جا کر اُسے غور سے دیکھا اور پوچھا۔

"یہ تم ہو نکہت بی بی ——— تم ——— اس محل میں رانی بن کر تم کیسے آگئیں ——— ؟" ہوا کے جھونکوں سے اُس کے بال اُور کپڑے لہرا رہے تھے۔ ——— اُس نے ہر ہر چیز کا جائزہ لیا۔ اُور پھر اپنے آپ کو دیکھا۔ آپ کے کپڑے کس قدر بُرے تھے۔ اپنے کپڑوں کے ساتھ وہ کیوں کر اس شاندار مسہری پر قدم دھر سکتی ہے ——— مارے احساس کے اُس کی آنکھوں میں آنسو پھر سے اُمنڈ آئے ——— اُس نے اپنے اُڑتے ہوئے بالوں کو اپنے پتلے پتلے ہاتھوں سے پیچھے کی طرف سمیٹا اُور جوڑا باندھ کر آئینے کے سامنے بیٹھ گئی ——— اُس کے تصور میں رنگین ساڑیاں لہرانے لگیں اُور پھر ایک ساڑی جو پیڑی سبز تھی اُور جس پر بڑے بڑے کالے پھول تھے، آئینے سے نکل کر اُس کے گالوں کو چھونے لگی۔ اُس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا ——— اسلم صاحب کھڑے تھے ——— اُور ذرا جھجک جھجک کر بول رہے تھے۔

"نکہت تم یہ نہ سمجھنا کہ اِس طرح مَیں نے تمہارے احساسات کو ٹھیس پہنچانی چاہی ہے، بلکہ تم یہ سوچو کہ اب تم اِس گھر کی ایک فردِ ہی ہو۔ میرے کئی ملنے جلنے والے آئیں گے اور اگر وُہ تمہیں اِن کپڑوں میں دیکھیں گے تو یہ تمہاری ہی نہیں میری اپنی بھی بے عزتی ہو گی ——— وُہ حسبِ عادت ہولے ہولے سکرائے یہ پیسے تمہاری تنخواہ سے کاٹ لئے جائیں گے۔ اور اُنہوں نے ایک بڑا سا بنڈل اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اِس میں کچھ کپڑے ہیں ———"

نکہت بالکل بے دست و پا ہو گئی ——— اُس نے تھوڑی دیر تک تو یونہی اسلم صاحب کو خالی خالی نظروں سے دیکھا اور پھر بنڈل ایک طرف پھینک کر وُہ اسلم صاحب سے چمٹ گئی ——— اسلم صاحب نے محبت سے اُس کے سر پر تھپکیاں دیں اور وُہ سسک سسک کر روتی رہی۔

"آپ کتنے اچھے ہیں ——— آپ اِنسان نہیں دیوتا ہیں ……… آپ ……… آپ ………"

اسلم صاحب نے جواب میں کچھ بھی نہ کہا، بلکہ ایک بزرگانہ انداز سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے رہے۔ جب نکہت کے دِل کا غبار نکل گیا تو وُہ سہم کر دُور کھڑی ہو گئی ——— پھر بھی وُہ نوکر تھی اور وُہ اُس کا آقا۔ یہ کیسی حرکت اُس سے سرزد ہوئی ——— اُس نے سہم

کر اسلم صاحب کو دیکھا، شاید وُہ کچھ تنبیہہ کریں ــــــ مگر وُہ یونہی خاموشی میں چلے گئے۔ ــــــ مگر اُن کی آنکھوں میں آنسو کیوں چمک رہے ہیں۔ اُس نے بڑے دُکھ سے سوچا۔

اب اُس کے دِل کا غبار نکل چکا تھا اور وُہ خود کو بُہت پر سکون۔ محسوس کر رہی تھی ــــــ گلابوں کی خوشبو اُس کے دِل تک اُتر چکی تھی ــــــ اُس کا جُوڑا ڈھلک کر کُھل چکا تھا ــــــ آنکھیں جو اب تک بار بار بھر بھر آ رہی تھیں صاف شفاف ہو چکی تھیں۔ ــــــ اُس نے دھیرے سے بنڈل کھولا اور کپڑے دیکھنے لگی۔ ــــــ چار چھ ساڑیاں تھیں اور اُسی کے جوڑ کے بلاؤز ــــــ بھلا اُنہیں میرا ناپ بھی معلوم ہو گیا ــــــ اُس نے حیرت سے کپڑے اُلٹ پلٹ کئے ــــــ یہ کپڑے وُہ کئی بار دکانوں میں لٹکتے دیکھ چکی تھی ــــــ جھل مل کرتے، باغ و بہار لباس ــــــ تیار شدہ کرلیس خریدو اور پہن لو ــــــ اُس نے ہزاروں بار تمنا ضرور کی تھی مگر خرید کبھی نہ سکی تھی ــــــ آج مسرتوں کے

کے دروازے اُس پر کھُل گئے تھے ـــــــــ الہ دین کا چراغ جل گیا تھا کہ جو سوچو وہ حاضر ـــــــــ!

اُس نے ساتھ والا دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ اُس نے بڑی معصومانہ حیرت سے دیکھا کہ حمام کے ٹائلز کس قدر صاف شفاف اور اُجلے اُجلے تھے۔ اور شاور ہاتھ ذرا بڑھنے پر ہی برسات کی پھوار کا سا منظر پیش کرنے لگا ـــــــ اُس نے اپنا لباس اُتار دیا اور شاور کے نیچے اپنے لمبے لمبے بال کھول کر کھڑی ہو گئی ـــــــ بارش کی اوّلین پھوار سے جیسے اُس کا جسم بھیگ اُٹھا اور وُہ لہک لہک کر گنگنانے لگی۔

وُہ اپنا بھیگا بھیگا جسم لئے آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

اُس نے بڑی مسرت کے ساتھ وُہ کپڑے پہنے۔ اپنے لمبے لمبے بالوں سے قطرہ قطرہ ٹپکتے پانی کو بڑی خوشی کے ساتھ دیکھتی رہی۔ اور جب وُہ پوری طرح تیار ہو گئی تو اُس نے ایک بار پھر آئینہ میں اپنا جائزہ لیا۔ وُہ بلکل بدل کر رہ گئی تھی۔

اَب اُس کے دِل میں ایک عجیب سی تمنّا جاگی کہ اسلم صاحب اُسے اِس لباس میں ضرور دیکھیں ـــــــــ لیکن وُہ اُن کے پاس جائے کیسے ـــــــــ!؟ بڑی دیر تک وُہ کوئی بہانہ تلاش کرتی رہی۔

آخر اُس نے ایک حل سوچ ہی لیا۔

اب آپ یہ بتا دیجئے کہ میرے ذمہ کیا کیا کام ہونگے بس میں جا کر ایُں
پوچھوں گی۔

وُہ اسلم صاحب سے اجازت لے کر اُن کے کمرے میں داخل ہوئی
تو وُہ چِڑ کر بولے

"مجھے بار بار اجازت لے کر تمہارا اندر آنا بالکل پسند نہیں۔۔۔"
۔۔۔ وُہ گھبرا گئی۔ اُس کا چہرہ اُتر سا گیا۔ ــــــــ وُہ بول رہے تھے
مَیں بھی آخر انسان ہوں۔ غصّہ مجھے بھی آتا ہے اور بڑی
بڑی عجیب عجیب باتوں پر آتا ہے۔ تم سے کس نے کہا ہے کہ جب آؤ اجازت
لے کر ہی آؤ۔

نکہت نے سکون کا لمبا سا سانس لیا۔

"مَیں یہ پوچھنے آئی تھی کہ میرے ذمّہ کیا کام ہوں گے ــــ!"

اسلم صاحب نے اُسے سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور صاف سیدھے
لہجے میں بولے۔

ہاں اب تم بہت اسمارٹ نظر آ رہی ہو ــــــــ کپڑے پسند
آئیں ؟"

اُس نے سر ہلا دیا۔

اور کمرہ کیسا لگا ؟

جی بہت اچھا۔

اُنہوں نے اطلاعاً کہا ــــــــ ساتھ ہی باتھ روم بھی ہے۔"

"جی ہاں ــــــ وہ خوشی سے بولی ــــــ میں تو نہانے باتھ

لیا ہے۔"

اسلم صاحب نے گھنٹی بجائی اور نوکر آیا تو بولے

"بچوں کو لے آؤ۔"

تھوڑی دیر بعد اُس کے سامنے تین بچّے کھڑے تھے۔

یہ میری سب سے بڑی بیٹی سلمیٰ ہے ــــــ اُنہوں نے ایک

دبلی پتلی اور لمبی سی گوری سی بچی سے نکہت کا تعارف کروایا۔

سلمیٰ نے سفید اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ بال انگریزوں کی طرح کٹے ہوئے تھے

اور صورت سے بھی بالکل انگریز ہی لگتی تھی۔

یہ جونیر کیمبرج میں پڑھتی ہے ــــــ چودہ سال کی ہے۔ پھر انہوں نے بیٹے

سے متعارف کروایا۔ یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے انوار ــــــ سیونتھ میں ہے

اور پھر ایک چھوٹی سی بچی کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ اور یہ میری سب سے چھوٹی

بٹیا نجمی ہے ــــــ فورتھ میں ہے ــــــ بہت بھولی بھالی اور

سادہ طبیعت ــــــ البتہ یہ انوار میاں تمہیں بہت دق کریں گے

"وہ ہنس کر بولے۔

نکہت نے باری باری ان تینوں کو دیکھا۔ تینوں نے باپ کی طرف
گویا پوچھتے ہوں۔
"یہ ہے کون؟"
اسلم صاحب بچوں سے کہہ رہے تھے۔ "دیکھو بچو اب یہ تمہارے
ساتھ ہی رہا کریں گی آں ...."
ابھی اسلم صاحب کی بات منہ میں ہی تھی کہ انوار پھٹ سے بول اٹھا۔
"اچھا تو آپ نے ہمارے لئے جس گورنس کا اشتہار دیا تھا یہی
ہیں وہ۔"
اسلم صاحب نے اُسے بُری طرح گھورا ــــ ایسی بدتمیزی کی
بات نہیں کیا کرتے ــــ یہ آنٹی ہیں تمہاری۔
نکہت نے ذرا مسکرا کر نجمی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا ــــ نجمی
نے اُسے بھولپن سے دیکھا اور پھر شرما گئی۔
جب وہ چاروں کمرے سے باہر نکل رہے تھے تو اسلم صاحب نے
نکہت سے کہا۔
"نکہت آج سے یہ تینوں تمہاری نگرانی میں ہیں۔ تم ان سے جیسا چاہو
ویسا سلوک کر سکتی ہو۔
یہ تمہارے ہی بچے ہیں!"

یہ تمہارے ہی بچے ہیں!
یہ تمہارے ہی بچے ہیں!
یہ تمہارے..........
نکہت نے سر گھما کر اسلم صاحب کو دیکھا جو بالکل بے تعلق سر جھکائے اپنے کاغذات میں اُلجھ گئے تھے۔!

نکہت نے الماری کھول کر اندر نظر ڈالی تو کپڑوں کا ایک انبار تھا۔ مگر بے حد بے ترتیب، شلواریں، غرارے، اسکرٹ، کانونٹ یونیفارم، ساڑیاں سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اور زیورات کا بکس الگ کھلا پڑا تھا۔ ——— اس نے بڑی اُلجھن سے سر جھٹکا اور سلمیٰ سے بولی۔

"سلمیٰ ——— یہ کپڑے کس نے بے ترتیب کئے ہیں۔
"آیا نے ——— سلمیٰ بالوں میں کنگھا پھیرتی ہوئی بولی۔
"عجیب واہیات آیا ہے۔"
سلمیٰ اسٹول پر سے اُٹھ کر نکہت کے قریب آئی اور بولی۔

"آنٹی! اسی لئے تو ڈیڈی نے ایک گورنس کی ضرورت محسوس کی
ابھی آپ گھر کے دوسرے کمروں میں جاکر دیکھیئے۔ تب پتہ چلے گا کہ کس
طرح افراتفری مچی ہے۔"
نکہت نے ذرا ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"اور تمہاری ممی کیا کرتی رہتی ہیں پھر ________"
سلمیٰ تھوڑی دیر تو چپ چاپ رہی پھر بولی ________ "ممی کو مرے
تو سال سے بھی زیادہ ہو گیا۔"
"اوہ" ________ وہ شرمندگی سے بولی ________ اُف کتنی بڑی
ٹریجڈی ________ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولی تب ہی ڈیڈی اس
قدر خاموش اور بیزار بیزار سے رہتے ہیں نا ________!"
سلمیٰ نے گویا الفاظ ڈھونڈنے کی کوشش کی اور پھر بڑی صاف دلی
سے بولی ________ "نا ہیں یہ بات تو نہیں ہے۔ ممی اور ڈیڈی
کی کبھی بنی ہی نہیں۔"
ہائے ________ وہ کیوں ________ نکہت بے تابی سے پوچھ بیٹھی۔
بس یوں ہی ممی ذرا تیز مزاج تھیں نا ________ اسی لئے ________ اور
وہ یوں بھی گھر کے کام کاج میں زیادہ دخل نہ دیتی تھیں۔ سارا کام نوکر
ہی سنبھالے رہتے تھے ________ یہ ضرور ہے کہ گھر کی مالکہ کی موجودگی

کے اِحساس کو وُہ کبھی اپنے دِل سے نہ ہٹا سکتے اور یُوں زیادہ مستعد رہتے مگر اُدھر جب سے اُن کی ڈیتھ ہوئی ہے یہ سب لوگ بالکل ہی نکمّے ہو گئے ہیں۔

ماٸیں غیر ذمہ دار ہوں تو بیٹیاں آپ ہی آپ ذمّہ دار اور سمجھ دار ہو جاتی ہیں —— یُوں تو ایک لڑکی کیلئے چودہ سال کی عمر ایسی کم نہیں ہوتی، تب بھی یہ سلمیٰ کتنی سمجھ دار ہے۔

"تم اِنہیں ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتیں۔ —— وُہ سوچتے سوچتے بول پڑی۔

آپ سے ایک بات بتاؤں آنٹی - وُہ بڑے سیدھے لہجے میں بولی۔

"ممّی بے حد تیز مزاج تھیں، دن بھر اِس قدر اُلجھتی رہتی تھیں کہ اِس تیزی تندی سے پہلے خود بخود چِڑ سی ہو گئی۔ اَب کوئی کچھ ہی کرے، مجھے زبان ہلانا بھی بار ہوتا ہے۔ وَیسے اپنے طور پر مَیں خود ہی اپنا کام کرنے کی کوشش کر لیتی ہوں مگر آنٹی آپ جانیں ماحول کا بھی تو ہاتھ ہوتا ہے نا ——؟

نکہت اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھی —— اور وُہ کہے جا رہی تھی۔

"ہمارے یہاں تو بچپن سے ہی ایسا ماحول ہے کہ جو کریں نوکر کریں —

پھر بھی میری ذمہ داری اور سگھڑاپے کو یہ انوار گڑھا پلٹ کرکے رکھ دیتا ہے ـــــ اور پھر یہ آیا سب سے بڑھ کر ہے۔
اگر کبھی یہ کہوں کہ نیلی اسکرٹ نکال لا تو جب تک ساری الماری کو تہ و بالا نہ کر ڈالے تب تک اسے اسکرٹ نہیں مل سکتی۔

نکہت نے کچھ نہ کہا ـــــ یہ بچی ماں کی محبت کی لوٹی ہوئی کس قدر عقلمند ـــــ سمجھدار اور ذمہ دار تھی ـــــ اس نے سلمیٰ کے دُبلے پتلے اور قدرے لمبے جسم کو دیکھا اور بولی ـــــ

تم بہت دُبلی ہو سلمیٰ ـــــ

وہ سر میں کنگھا مارتے ہوئے بولی ـــــ اب تو آنٹی آ گئی ہیں ـــــ اور مسکرانے لگی ـــــ نکہت بھی مسکرا دی ـــــ اور پھر سے الماری پر جُت گئی۔

آج کیا پہنوں گی ـــــ" نکہت نے مڑ کر پوچھا

آج تو سٹرڈے ہے ـــــ یونی فارم کی قید نہیں ساڑی باندھ لوں گی۔"

نکہت نے پنک کلر کی ساڑی اور ویسا ہی بلاؤز نکال کر میز پر رکھا۔ اور پیچھے کھڑی ہو کر سلمیٰ کے فراک کے ہُک کھولنے لگی۔

"کیا کر رہی آپ ـــــ سلمیٰ ایک دم مڑ کر بولی۔

"تو کیا کر رہی ہیں آپ" ـــــــ سلمٰی ایک دم مڑ کر بولی۔
نکہت حیرت سے اُسے دیکھنے لگی ـــــــ پھر غصّے سے بھنّا گئی۔
"ہائے مجھے شرم لگتی ہے ـــــــ میں آپی بدل لوں گی۔ اُس نے
کلائی پکڑ کر کہا۔
اَب کے نکہت نے غور سے سلمٰی کو دیکھا ـــــــ اُس کے گلابی پڑتے
ہوئے گالوں کو ـــــــ اُس کے سراپے کو اور پھر اُس نے سوچا کہ عورت
بیدار ہو رہی ہے۔
اُس نے پھر ایک لفظ بھی نہ کہا اور ذرا ذرا مسکراتی ہوئی کمرے سے
باہر نکل آئی۔
تینوں بھائی بہنوں کے کمرے ایک ساتھ لگے ہوئے تھے۔ کمرے اِس
قدر بڑے اور کشادہ تھے کہ اگر بیک وقت سو آدمی بھی اس میں آکر
رہ جاتے تو کسی قسم کی اڑچن یا شور شرابہ نہ ہوتا۔ نکہت حیرت سے
اِدھر اُدھر دیکھتی انوار کے کمرے میں داخل ہو گئی ـــــــ انوار کا کمرہ
بھی سلمٰی کے کمرے سے مختلف نہ تھا۔ وہی بے ترتیبی، وہی افراتفری،
اور یہاں پر تو ڈھیر سارا الم غلم بھی بکھرا پڑا تھا ـــــــ کرکٹ بیٹ،
وکٹ ـــــــ پنگ پانگ کی گیندیں ـــــــ بیڈمنٹن نیٹ ـــــــ
ہاکی ـــــــ فٹ بال ـــــــ نکہت نے گھبرا کر سارے الم غلم کو دیکھا۔ پھر

خود ہی ہنس دی ۔

اُس نے جھٹک جھٹک کر ایک ایک چیز اُٹھانی شروع کر دی۔ انوار بڑی دیر سے جوتوں کے بند باندھتا بیٹھا تھا۔ نکہت کی طرف اُس کی پیٹھ تھی اُس نے نکہت کی آمد کو محسوس ہی نہ کیا تھا ـــــ پٹکنے جھٹکنے کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی تو وُہ مڑا اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے شرارت سے چیخ کر بولا۔

ــ میس نکہت ایسا غضب بھی نہ کیجئے ـــــ

ابھی آگے جانے وُہ کیا کہتا کہ ہلکی سی ریپ ریپ کی آواز کے ساتھ اسلم صاحب اس کمرے میں آگئے اور بغیر نکہت کا نوٹس لئے وُہ تیزی سے انوار سے بولے۔

مِس نکہت نہیں ـــــ آنٹی ـــــ اور جیسے آئے تھے ویسے ہی چلے گئے۔

نکہت نے جلدی سے اُن کے پیچھے پیچھے باہر جا کر دیکھا۔ تو وُہ بارعب ہوتے ہوئے اپنے کمرے کو جا رہے تھے۔

نکہت اندر آئی تو انوار سراسیمہ سا بیٹھا تھا۔

"معقول ہو گئی ـــــ وُہ ندامت سے بولا۔"

کوئی بات نہیں آپ لوگ تو میرے آقا ہیں ـــ

انوار نے اُس کے چہرے کی آزردگی کو بھانپ لیا اور اُٹھ کر اُس کے قریب آکر بولا۔

"آنٹی آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں نا۔ ؟!"

نکہت نے اُس کے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنے گلے میں ڈال لئے اور وہ اپنی باہنوں کے سہارے اُس کی گردن سے جھول گیا۔

نجمی سب سے خاموش بھولی اور سب سے الگ تھلگ رہنے والی بچی تھی ——— جب نکہت نے اُسے کپڑے بدلوائے اور کنگھی کر کے اُونچی سی پونی ٹیل باندھ دی تو وہ مارے خوشی کے اُس سے لپٹ پڑی۔

"آنٹی آپ کتنی پیاری ہیں ——— سو سویٹ۔!"

تینوں تیار ہو گئے تو وہ اُن کے ساتھ باہر پورٹیکو میں نکل آئی۔

شوفر نے گاڑی (لمبی سی گاڑی ——— ایسی انہونی تمنا جس کا خواب بھی نکہت کے بس کا روگ نہ تھا) پورٹیکو میں لاکر کھڑی کر دی اور وہ اُن تینوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اُن کے ساتھ کانونٹ چل دی ——— انوار کو دوسرے کانونٹ میں چھوڑا اور دونوں لڑکیوں کو الگ کانونٹ میں چھوڑ کر وہ پھر سے گاڑی میں آبیٹھی۔ ——— اب گاڑی میں کوئی نہ تھا ——— آگے شوفر، پیچھے وہ ——— اُس نے شیشے بڑا کر دروازے سے کہنی ٹکا دی ——— بڑی معصوم نگاہوں سے

وُہ دوکانوں کو دیکھنے لگی ـــــ گاڑی بالکل نئی تھی اور خوب تیز اُڑی جا رہی تھی ـــــ ابھی کسی چیز پر اُس کی نگاہ ٹکتی بھی نہ تھی کہ گاڑی آگے پھسل جاتی ـــــ اُسے یہ سب کچھ کتنا اچھا لگ رہا تھا ـــــ مگر یہ ننھا سا وسوسہ اُس کے دِل کو کچوکے دیئے جا رہا تھا کہ کہیں اُس سے یہ جنّت چھن تو نہ جائے گی ـــــ ؟!!

موٹر پورٹیکو میں آکر ٹھہری تو اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ کوٹھی آگئی ہے شوفر نے دروازہ کھول کر کہا۔

"اُتریئے میم صاحب ـــــ" وُہ بُری طرح چونکی اور ساڑی کا پلّو سنبھالتی نیچے اُتر آئی۔

بچّوں کو کانونٹ چھوڑ آنے کے بعد وُہ پھر سے ان کے کمروں میں پہنچ گئی ـــــ ہر ہر چیز ٹھور ٹھکانے پہ رکھی، نوکر کو بلا کر گرد صاف کروائی ـــــ میلے کپڑے دھوبی کو دِلوائے ـــــ صاف کپڑے ترتیب سے جمائے ـــــ اِسے کام کرتے ذرا بھی تکان محسوس نہ ہو رہی تھی ـــــ بلکہ اُس کا جی یہ چاہ رہا تھا کہ کام اور بڑھتا ہی جائے اور وُہ مصروف ہی رہے ـــــ عمر بھر ـــــ ہر لمحہ ـــــ ہر وقت ـــــ

کمرے صاف ہو گئے تو وُہ پھر بیکار ہو گئی۔

بیکاری بھی کس قدر خوش گوار تھی ——— وہ اُٹھی اور کوٹھی دیکھنے کی خاطر اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔

نکہت نے اپنی زندگی میں فلمیں بھی بہت کم دیکھی تھیں ——— مگر جو کچھ بھی دیکھیں تھیں ان کی شان و شوکت اسلم صاحب کی کوٹھی سے بڑھ کر ہرگز نہ تھی ——— آخر اسلم صاحب کرتے کیا ہیں کہ اس قدر امیر ہیں ——— اور پھر بڑی بات یہ کہ اتنے امیر ہونے کے باوجود غرور اور اکڑ نام کو نہیں ——— کس قدر میٹھے سبھاؤ میں بات کرتے ہیں۔

چلتے چلتے نکہت رکی۔ اُس لمحے وہ باغ میں سے گزر رہی تھی۔ کہ ناگہاں اُس کی نظر گلاب کے گملے پر جا پڑی تھی، گملا اِس قدر گندا ہو رہا تھا۔ اُف پتیاں اس میں ٹوٹ گری تھیں اور کچرا پھولوں کی خوب صورتی کیلئے داغ ثابت ہو رہا تھا ——— یہ پھول تو یقیناً بدیشی ہو سکتے ہیں۔ گہرے زرد اور اِس قدر بڑے بڑے کہ اگر میں اپنی دونوں ہتھیلیاں جوڑ لوں تو بھی ان میں ایک پھول نہ سما سکے۔

وہ پتیاں چنتی ہی بیٹھی تھی کہ اُدھر سے اسلم صاحب کسی کام سے آنکلے ——— وہ رُک گئے۔ ان کے چہرے سے ترشی مترشح تھی ———

"نکہت" ——— وہ تیزی سے کہہ کر رُک گئے ———

"جی" ——— وہ گھبرا کر پلٹی اور ہاتھ جھٹکتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہاں کیا کر رہی ہو تم ———!"

"جی ——— جی کچھ بھی نہیں۔"

اسلم صاحب نے یہی نہ کہا ——— بس اتنا کہہ کر چلے گئے۔

"تمہیں بچوں کے کام کے لئے رکھا ہے ——— نوکر نہیں بنایا ہے کہ گھر بھر کو سمیٹتی پھرو ———"

نکہت اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہونے تک تو یونہی کھڑی رہی پھر ہنستی ہوئی گملے پر جھک گئی۔

ایک دو گھنٹے میں اُس نے تمام گملے صاف کر دیئے۔ جاتے جاتے مالی کو تھوڑی سی تنبیہہ کرتی گئی کہ سرکار نے اتنے پیارے پیارے قیمتی پھول یوں برباد کرنے کیلئے تو نہ منگوائے ہوں گے۔

اَب ایک بج رہا تھا ——— وہ بالکل بیکار سی تھی ——— بچوں کے آنے کا وقت قریب ہو رہا تھا ——— وہ ڈائننگ ہال میں جا پہنچی ——— صبح کو ناشتے کے وقت بچوں نے اُسے کچھ کھانے کی مہلت ہی نہ دی تھی ——— ٹوسٹ اور مکھن کھا کر یونہی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے ——— اور اسلم صاحب! اُن کی تو اُس نے خبر ہی نہ لی تھی ——— جانے کیا کھایا ہوگا۔ بیرا البتہ یہ بتا رہا تھا کہ صاحب بیڈ ٹی لیتے کے کوئی دو گھنٹے بعد بالکل ہلکا ناشتہ کرتے ہیں ——— وہ اس خیال کے آتے ہی

سب کچھ چھوڑ چھاڑ اسلم صاحب کے کمرے میں جا پہنچی ـــــــ یہ اُن کا ڈرائنگ روم تھا ـــــ باہر والا کمرہ جہاں اُنہوں نے نکہت کو پہلی بار وزٹ کیا تھا، اُن کے آفس کا بھی کام دیتا تھا۔ اور ملنے جلنے والے بھی وہیں آ کر بیٹھتے تھے

وُہ کمرے میں پہنچی تو اُسے دیکھ کر ذرا بھی حیرت نہ ہوئی کہ اُن کا اپنا کمرہ بھی بچوں کے کمروں کا کاربن تھا ـــــ اُسے حیرت ہوئی کہ آخر ڈھیر سارے ڈیکوریشن کس کام کے ہیں ـــــ جب کہ ہر ہر چیز سلیقہ طلب ہے ـــــــ امی سچ ہی تو کہتی ہیں کہ گھر کی مالکن کے بغیر گھر گھر نہیں کباڑ خانہ ہو جاتا ہے۔

اُس نے وہی کارروائی شروع کر دی ـــــــ واہ یہ کوٹ تو دیکھو ـــ بجائے ہینگر کے یونہی شولڈر کے سہارے کیل سے لٹک رہا ہے اُف کتنی شکنیں پڑ گئی ـــــ اُس نے کوٹ اُٹھا کر اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور زور سے جھٹکا ـــــ ایک تصویر کے نقوش بالکل اسلم صاحب ایسے ہیں ـــــ آنکھیں ناک، بال، مسکراہٹ کا انداز ـــــ اُس نے سر کو زور سے جھٹکا دیا ـــــ یہ ہر بار آنکھوں کے آگے ـــ اسلم صاحب کیوں ابھر آ رہے ہیں ـــــ میں اُن کی مسز کی تصویریں بھی؟ انہی کے نقوش کی تلاش کر رہی ہوں۔ ہِش!

اُس نے ہر قسم کے خیالات کو جھٹک کر پھر سے تصویر دیکھنی شروع

کی ـــــــ یہ تصویر حسن کی بھی تھی۔ سلمٰی سے حد درجہ مشابہت رکھتی تھی ـــــــ یقیناً یہ مسز اسلم رہی ہوں گی ـــــــ اُس نے بڑی احتیاط سے تصویر پلو سے صاف کی اور اُسے یونہی کوٹ کی جیب میں رکھ دیا ـــــــ

ابھی وُہ کوٹ ہینگر سے لگا ہی رہی تھی کہ کسی کام سے اسلم صاحب اندر چلے گئے۔ ـــــــ وُہ بُری طرح سراسیمہ ہو گئی ـــــــ

اسلم صاحب بھی کچھ پریشان سے ہو گئے ـــــــ اُس کے ہاتھ میں کوٹ دیکھ کر مسکرا دیئے اور اُس کے بہت قریب آ کر بولے ـــــــ

"گر مَیں تو بچہ نہیں ہوں نکہت"

نکہت نے اپنا پورا چہرہ اُٹھا کر پوری ہمت کے ساتھ اُن کے چہرے کو دیکھا اور بولی۔

"مرد تو فطرتاً بچہ ہی ہوتا ہے"

"وُہ کیسے ـــــــ" وُہ نرمی سے بولے ـــــــ

"اُسے بھی دیکھ ریکھ کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی ایک بچے کو ـــــــ آپ نے کبھی اپنے کمرے اور بچوں کے کمروں میں کوئی فرق بھی محسوس کیا ہے ؟" وُہ صاف دِلی سے ہنس رہی تھی ـــــــ

اسلم صاحب ذرا جھینپ کر بولے۔

"ہاں ——— جی ——— وہ تو ہے مگر نوکر جو ہیں ۔"

نکہت جھلا گئی ——— جیسے دیکھو وہی نوکر نوکر کی رٹ لگائے ہے

——— حد ہے ——— بھلا نوکر بھی کوئی کام گت سے کرتے ہیں ———

پھر اُس نے صبح سے لے کر اَب تک کے کاموں کی ساری رپورٹ دے

ڈالی ——— آخر میں بولی ———

مجھے تو اَب بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ مجھے واقعی ایک ایسی نوکری

مل گئی ہے کہ مَیں رانی جیسی ہو گئی ہوں ——— بھلا دو سو روپے

اِس زمانے میں کم ہوتے ہیں ——— کئی جگہ درخواستیں دے دے

کر ہار گئی تھی ——— اب تک مجھے اپنے نصیب پر، اپنی اِس زندگی

پر یقین نہیں آ رہا ہے ———" اُس نے کُھلی کُھلی آنکھوں سے اسلم صاحب

کو دیکھا اور لجاجت سے بولی ———

دیکھئے آپ مجھے کسی کام سے منع نہ کریں ورنہ مَیں احساسِ ندامت

سے گُھٹ کر مر جاؤں گی ———

"تم عجیب و غریب قسم کی لڑکی ہو نکہت ———" وہ تنگ کر بولے

——— مَیں تمہیں اِس بات کی اجازت نہیں دے سکتا ———

تم نوکروں سے کام ضرور لے سکتی ہو مگر خود نوکر بن کر نہیں رہ سکتیں ———"

"تم نوکرانی بن کر نہیں رہ سکتیں ———"

"تم نوکر ہی کر نہیں ....

" تم ....تم ....

اسلم صاحب غصّہ ہو کر چلے گئے تھے اور وُہ خوشی اور غم کے ملے جلے احساسات تلے دب کر اتنی بے بس ہو گئی تھی کہ اپنا وزن آپ سنبھال بھی نہ سکی اور دھم سے صوفے میں گر گئی۔

دوپہر کے کھانے پر ایک عجیب و غریب حادثہ نے جنم لیا ——— اسلم صاحب نے آج تک کھانے کی میز پر کسی کو نہ بلایا تھا۔ بس تینوں بچّے اور وُہ خود ——— آج جب میز لگ گئی تو اُنہوں نے بیرے سے کہا ———

" جا کر میم صاحب کو بلا لاؤ ———"

بیرے نے پہلے تو حیرت سے اُنہیں دیکھا اور پھر چل دیا۔ نکہت ڈری ڈری آئی اور اُن کے برابر کھڑی ہو گئی۔

"آپ نے مجھے بلایا ———؟"

"کیوں کھانا کھانے کا ارادہ نہیں ہے ——— وُہ سنجیدگی سے بولے۔

اُن کی بھرپور سنجیدگی سے نکہت خواہ مخواہ ڈر سی گئی ——
جانے کیوں ایک شکایت اُس کے ہونٹوں سے پھسل پڑی۔
پھر ناشتہ پر بھی بلایا ہوتا مجھے۔
اسلم صاحب نے کچھ حیرت اور کچھ محبت سے اُس کی طرف دیکھا اور بولے۔
آج مَیں نے ناشتہ کیا ہی نہیں۔
نکہت اِس بُری طرح شرمندہ ہوئی کہ اُس کی ناک پر مارے ندامت کے پسینہ آگیا —— اُس کے پیر کانپنے لگے ——
اسی دم سلمیٰ نے اپنے بازو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"آنٹی آپ یہاں آجائیے ——"
انوار شرارت سے بولا۔
"آنٹی گیسٹ آف آنر ہیں اِس لئے اُن کو ٹیبل ہیڈ پر جگہ ملنی چاہئے ——"
اِتنے میں بنّی یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔
"آنٹی صبح آپ یہاں بیٹھ جائیے —— پلیز ——
نکہت کچھ بھی نہ بول سکی اور جا کر سرے پر بیٹھ گئی ——
اُس کے سیدھے ہاتھ پر سلمیٰ تھی اور بائیں ہاتھ پر اسلم صاحب کی

چیز ــــــ نوالے اُس کے حلق میں پھنستے رہے ــــــ وُہ کوشش کر کے نوالہ نگل بھی لیتی تو حلق میں کوئی چیز پھنسی پھنسی محسوس ہوتی۔

اُسے حلق میں کوئی چیز پھنسی پھنسی محسوس ہو رہی تھی۔ اُسی دم شانو آ کر بولی ــــــ

"آنٹی مَیں نے ڈاکٹر صاحب کو فون کر دیا ہے"

بیٹی کی آواز پر اسلم صاحب نے ذرا سی آنکھیں کھولیں تو سامنے نکہت کو بیٹھا پایا۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے ــــــ نکہت نے بیتابی سے پوچھا"

"اچھا ہی ہوں"۔ وُہ ذرا اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

"کیا مَیں سو گیا تھا؟ مجھے تو اِتنا یاد ہے کہ تم کمرے میں داخل ہو رہی تھیں، اُس کے بعد آنکھ لگ گئی شاید۔"

نکہت جانتی تھی اسلم صاحب یہ بات بالکل پسند نہیں کرتے کہ

وُہ اُن کی ذرا بھی دیکھ ریکھ کرے ــــــــ ایک طرف اُن کے غصّہ کا خیال اُور ایک طرف خود اپنے دِل کا خیال، اُس کا دِل عجب کشمکش میں گرفتار تھا ــــــ وُہ اپنے محسن کا خیال کیسے نہ کرے جس نے اُسے زندگی اُور زندگی کی ہر نعمت بخش دی تھی ــــ وُہ زیادہ سے زیادہ ڈانٹ ہی تو دیں گے نا ــــــ اپنے محسن کی ایک آدھ بات سُن لینا ایسا کیا بُرا ہے ــــــ وُہ دھیرے سے اُٹھ کر اُن کے پلنگ تک پہنچ ہی گئی اُور سرہانے بیٹھ کر سر دبانے لگی۔

اسلم صاحب نے ناگواری سے اُسے دیکھا مگر پھر درد کی شدّت کے سامنے بے بس ہو کر آنکھیں موندلیں۔ اُس کی آنکھیں آپی آپ بھر آئیں ــــــ آنسو چھلکنے کو بے قرار ہو رہے تھے۔

وُہ کھانا کھا کر میز پر سے اُٹھی تو اُس کی آنکھیں سُتی ہوئی تھیں وُہ کیسے ان احسانوں کو بھولے گی۔ اُسے ایک غم یہ گھیرنے لگا کہ احسانوں کے بوجھ تلے وُہ دب کر دم ہی نہ چھوڑ دے۔

بہت سارے دِن گزر گئے۔

جب پہلی تاریخ آئی تو اسلم صاحب نے دو نوٹ اُس کی ہتھیلی میں ٹھونس دیئے۔

نکہت نے تعجب سے اُنہیں دیکھا۔

"آپ نے کہا تھا کپڑوں کے پیسے تنخواہ پر کاٹ لیں گے"۔

"ہاں کہا تو تھا"۔

پھر؟

"یہ تو نہیں کہا تھا کہ پہلی ہی تنخواہ پر کاٹ لیں گے ——— ابھی تو عمر پڑی ہے"۔

یہاں آکر تو اُس کی زبان ہی جیسے کسی نے چھین لی تھی ——— کوئی بات ہی نہ سوجھتی ——— آج بھی وُہ خاموش رہ گئی ——— اُس کی امی کتنی خوش ہوئی تھیں۔ اُس نے اسلم صاحب کی کس قدر تعریفیں کر ڈالیں ۔ اُن کی زندگی سے متعلق ہر ہر چھوٹی بڑی بات امی کو سنا ڈالی۔ اکدم امی چونک کر بولیں۔

اُن کی بیوی مر چکی ہیں؟"

"جی ہاں ——— پھر؟" وُہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ اِس میں بھلا ایسی کونسی چونک جانیوالی بات تھی۔

بڑی دیر تک امی خاموش رہیں پھر بولیں۔

"زمانہ بُرا ہے بیٹی ـــــ ہر اِنسان کے ساتھ شیطان لگا ہوا ہے"
وُہ اِتنی نادان تو تھی نہیں ـــــ امی کی بات اُس کے دِل میں جاکر چُبھ گئی ـــــ بھلا اِس قدر دیوتا صفت آدمی اور اُس کے تعلق سے ایسی رکیک بات سوچی جائے ـــــ؟
مارے غصّے اور غم کے اُس نے امّی سے کچھ بھی نہ کہا ـــــ مہینے کے مہینے تنخواہ دینے، ایک دِن کی چھُٹی کی بات طے کی گئی تھی ـــــ آج پہلے ہی مہینے امّی نے کیسی عجیب بات سنا ڈالی۔ اگر وُہ ایسے ویسے آدمی ہوتے تو ایک مہینہ تو خیر لمبی بات ہے ایک دِن میں ہی شیطانی حرکت کر سکتے تھے ـــــ مگر امی کو کون سمجھائے؟ دِن بھر وُہ اپنے چھوٹے سے بے رنگ کمرے میں اکیلی پڑی رہی ـــــ دوسرے دِن بھی وہ یونہی پڑی رہی ـــــ شام کو جب گلی میں سناٹا چھا رہا تھا، موٹر کے تیز ہارن کی آواز گونجی اور پھر تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی ـــــ یہ آواز نکہت کی جانی پہچانی تھی ـــــ اسلم صاحب کا دھیمے دھیمے انداز میں دروازہ پیٹنا ـــــ کئی بار جب وُہ دروازہ بند کئے لیٹی رہتی تو جائے نوکروں یا بچّوں کے خود اسلم صاحب اُسے کھانا کھانے کیلئے بلاتے ـــــ ایسے میں اکثر وُہ ہلکے ہاتھ سے دستک دیتے

تو وہ سمجھ جاتی ـــــــ اُس نے دروازہ کھولا اور اسلم صاحب بغیر کسی تکلّف کے اندر چلے آئے ـــــــ اُس نے اتنی صاف دِلی سے نہ آنے کی وجہ بتا دی ۔ اُس کا سارا غصّہ اپنی امّی پر تھا ـــــــ اسلم صاحب کِس قدر دیوتا صورت آدمی تھے ـــــــ ذرا تو نہ بِگڑے ـــــــ بلکہ اُلٹا اُس کی امّی کی ہاں میں ہاں مِلانے لگے کہ " آپ ٹھیک سوچتی ہیں ، زمانہ ہی ایسا ہے ـــــــ "

پھر اُنہوں نے دبی زبان سے یہ کہا کہ آخر وُہ خود بھی کیوں نہیں نکہت کے ساتھ رہنے آ جاتیں ـــــــ وہ تھیں سیّد صاحب کی بیوی ـــــــ اُن کی غیرت کہاں برداشت کر پاتی ـــــــ وَیسے وُہ اسلم صاحب کے اخلاق سے ایسی متاثر ہوئیں کہ پھر کبھی اُن کے بارے میں کچھ نہ کہا ـــــــ

وُہ کار میں بیٹھ کر اُن کے ساتھ کوٹھی چلی آئی اور دِن پھر اِسی انداز سے بہار بن کر گزرنے لگے ۔

ایک دن اسلم صاحب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ نکہت بچّوں کو بڑے عجیب انداز میں سمجھا رہی تھی۔

بچو، تمہیں معلوم ہے کہ ڈیڈی اتنے امیر کیوں ہیں؟"

بچوں نے کوئی معقول جواب نہ دیا تو وہ بولی ——— تمہارے ڈیڈی کبھی اللہ کو نہیں بھولتے نا ——— اس لئے ——— بھلا بتاؤ تو تم میں سے کسی نے کبھی ڈیڈی کی طرح نماز پڑھی ہے۔ خدا کا شکر ادا کیا ہے ———؟"

بچے شرمندگی سے سر ہلانے لگے تو وہ بولی ——— آخر تمہیں اور کسی سے نہیں تو ڈیڈی سے ہی سیکھنا چاہیئے ———" وہ تہدیدی

انداز میں انگلی اٹھا کر بولی ——— آج تک میں نے کسی کو مارا نہیں ہے لیکن کل سے اگر کسی نے نماز قضا کی تو اسے بید سے ماروں گی۔"

بچے یہ محبت بھری دھونس سن کر ہنسنے لگے ——— ساتھ ہی نکہت بھی ہنسنے لگی۔

اور پھر انھوں نے دیکھا کہ ان کے کمرے سے ملا ہوا جو ان کا اپنا نماز کا کمرہ تھا، وہاں اب دن میں دو تین بار بچے نماز ادا کرتے دکھائی دیتے ——— نکہت خوشبو دار اگربتیاں سلگا کر اگر دان میں رکھ دیتی، اور کمرہ عجیب، مقدس خوشبو سے مہکتا رہتا۔

اسلم صاحب بڑی خوشی سے یہ سب کچھ دیکھا کرتے اور سوچتے کہ انھوں نے نکہت کو رکھ کر کتنا اچھا کام کیا ہے ——— نکہت جو بہت ہی اچھی، بہت ہی شریف لڑکی تھی، جو بڑے معصوم انداز سے انہیں دیکھا کرتی تھی اور خدا کے سامنے اپنے گناہوں کا، بالکل بچوں کے سے انداز میں اعتراف کرتی۔

اس دن کام سے فارغ ہو کر وہ ردالونگ چیئر پر آدھے لیٹے آدھے بیٹھے کوئی ناول دیکھ رہے تھے ——— یونہی پڑھتے پڑھتے انہوں نے کرسی گھمائی تو ان کی نگاہیں سامنے اٹھ گئیں ——— نکہت

خوشبودار دھوئیں میں گھری بڑی عاجزی سے کہہ رہی تھی۔
خداوند دو عالم ——— میں اپنا یہ گناہ کبھی نہ بھولوں گی
——— آج میری وجہ سے کسی معصوم کے آنسو بہے ہیں
تو مجھے معاف کر دے گا نا ——— شاید اس نے بچی کو ڈانٹا ہوگا
——— اور وہ ضرور روئی ہوگی ——— تبھی تو ———
اسلم صاحب کو سچ مچ ہنسی آگئی ——— جب وہ کمرے سے
نکل کر جانے لگی تو انھوں نے اسے بلا کر پوچھا ———
"تم خدا سے باتیں بھی کرتی ہو ——— ؟"
وہ معصوم لہجے میں بولی ——— جب کبھی میں اپنے دل پر
بوجھ سا محسوس کرتی ہوں، خدا کے سامنے سر جھکا کر سب کچھ کہہ ڈالتی ہوں
——— میرے دل کو بڑا سکون مل جاتا ہے۔"
وہ ہنسنے لگے۔ ——— کس نے سکھایا تمہیں اس طرح بوجھ ہلکا
کرنا ؟"
وہ آنکھیں جھپکا کر بولی ——— کسی نے بھی نہیں ———
دراصل مجھے یوں لگتا ہے کہ خدا اس طرح ہماری بات سن لیتا ہے۔"
"اور پھر کیا ہوتا ہے ——— "
وہ کچھ دیر کھڑی یونہی ساڑھی کا پلّو انگلی پر لپیٹتی رہی پھر بولی۔

"اگر ایسا نہ کروں تو شاید دل پھٹ کر رہ جائے ——" اس نے ایک اچٹتی نگاہ سے انھیں دیکھا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

اب نکہت، کوٹھی کے ماحول سے اس گھر کے باسیوں سے، ان کی عادات و اطوار سے اس قدر واقف ہو چکی تھی کہ گھر کی فرد بن کر رہ گئی تھی۔ اسے ہر ہر بات معلوم ہو چکی تھی، ہر ہر پروگرام اسی کی مرضی سے بنتا۔ اب خود وہ یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اس گھر کا سب سے اہم فرد وہی وہ ہے —— ایک دن اس بات پر اس نے اپنے آپ میں بہت دیر تک حیرت سے سوچا تھا کہ آخر اس کے بغیر اب تک کوٹھی والے زندہ کیسے تھے۔

ماں باپ کو اپنی پہلی اولاد سے بے پناہ محبت ہوتی ہے اسلم صاحب بھی سلمیٰ کے دیوانے تھے —— یوں وہ ایک سنجیدہ مزاج رکھتے تھے مگر ان کے چہرے پر ہنسی اسی وقت آتی تھی، جب وہ سلمیٰ کے ساتھ باتیں کر رہے ہوتے دیا چھپ جاکے ان کی مسکراہٹ کا راز نکہت غنی ——) ادھر نکہت کی مسلسل دیکھ ریکھ نے بچوں کو بدل کر رکھ دیا۔

تھا۔۔۔ سلمٰی جو ایک اونچی سی پتلی دبلی لڑکی تھی اب ایک دم تندرست جوان لڑکی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ غیر محسوس طریقے پر وہ اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ ایک بار دل ہی دل میں اسلم صاحب نے یہاں تک سوچ لیا کہ اب اس کی شادی جلد کر دینی چاہیئے۔

اسلم صاحب نے جب نکہت کے سامنے یہ سوال ڈالا تو نکہت پہلے تو خوب زور سے ہنسی پھر اک دم سنجیدہ ہو گئی ——— سلمٰی کی عمر ابھی صرف سترہ سال تھی جب کہ وہ خود اکیسویں میں تھی —— کیا اسے خود بھی ایک ساتھی کی ضرورت نہیں ہے ——
اسلم صاحب نے اس سے ہنس دینے کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔

"ابھی سے، اتنی چھوٹی تو ہے سلمٰی"

"لڑکیاں کبھی چھوٹی نہیں رہتیں ——— میں تو آج کل اس مسئلہ پر شدت سے غور کر رہا ہوں"

نکہت چپ رہ گئی ——— سلمٰی جلدی جلدی قدم اٹھاتے اٹھاتے اب نکہت کے بازو میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

مگر عمر تو نکہت ہی کی زیادہ تھی نا ——— پہلے جیون ساتھی کی ضرورت کسے زیادہ تھی ——— پھر اسے اپنی امی کا کہنا یاد آیا کہ بیٹیوں کو زیادہ بٹھانا نہیں چاہیئے —— پھر اسے اپنے منگیتر

کا خیال آیا۔ جسے پہلے وہ بے حد چاہتی تھی، پھر ایک دم امّی کا رویہ یاد آگیا۔ پتہ نہیں اس دن کیسے اس کی شادی کا ذکر چل نکلا تو وہ اپنی کسی سہیلی کے سامنے کہہ اٹھی تھیں کہ "ابھی جلدی کیا ہے؟"

نکہت کو کس قدر حیرت ہوئی تھی ——— پھر اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ آخر امّی نے بھی اپنی عمر میں آنسو رد دیئے ہیں ——— اب کہیں عمر کے اس دور میں آکر انہیں عیش میسر ہوا ہے تو وہ یہ نہیں چاہتیں کہ گھر آئی لچھمی یوں چلی جائے۔ نکہت جائے گی تو اس کی دولت بھی چلی جائے گی اور داماد کے ہاں رہنا انہیں کب قبول تھا ——— (وہ سیّد صاحب کی بیوی تھیں)

اس دن نکہت اتنی اداس رہی کہ اس کا دل کسی کام میں نہ لگا یونہی دل بہلانے کو وہ گڑیا بنانے بیٹھ گئی جس کے لئے ایک مدت سے نجمی اصرار کرتی رہی تھی۔

وہ سیپ کے ننھے منّے بٹنوں سے گڑیا کی آنکھیں بنا رہی تھی کہ نجمی بھی آبیٹھی۔

ہائے اللہ۔ آپ کس قدر خوبصورت گڑیا بنا لیتی ہیں۔ سلمیٰ بیٹھی نٹنگ کر رہی تھی ——— وہیں سے سر اٹھا کر بولی

"آپی کونسا کام بُرا کرتی ہیں"

نجمی ہنس کر بولی ——— "آنٹی اپنے بچوں کو تو خوب گڑیاں
بنا کر دیں گی —— ناں؟
گڑیا نکہت کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر ی مگر اس نے پھر سنبھال لی اور بے دلی
سے ہنس دی ——— نجمی سوال کئے جا رہی تھی۔
کیوں آنٹی آپ شادی نہ کریں گی ———؟
نکہت چپ رہی۔
"ارے ہاں! آنٹی ——— سلمٰی ہنس کر بولی —— اس دن کون
صاحب تھے وہ ——— جو آپ سے ملنے آئے تھے ——
"میرے فیانس تھے ——— "وہ ٹانکے لگاتی ہوئی بولی۔
بے حد اسمارٹ ہیں مجھے تو بہت پسند آئے تھے انکل۔
ابھی ابھی تک کی بات تھی کہ کوئی مسلمان کی تعریف کرتا تو نکہت
اسے اپنی تعریف سمجھ کر جھوم جایا کرتی مگر آج یہی بات سلمٰی کے منہ سے
سن کر اسے ذرا بھی خوشی نہ ہوئی ——— یونہی بے دلی سے
وہ گڑیا مکمل کرتی رہی ——— اسے یہ سوچ کر بے حد خوشی
ہوئی اور سکون ملا کہ امی اس کی شادی کے بارے میں ابھی بالکل
بھی KEEN نہیں ہیں۔
"وہ آپ کو اس قدر چاہتے ہیں آنٹی ——— "سلمٰی اس سے

دوستوں کا سا رویہ رکھتی تھی اور مذاق بھی کرجاتی تھی ـــ" اس دن آپ کسی کام سے اٹھ کر اندر آئیں تو کہنے لگ ـــــ میری نکہت جیسا کوئی تو ہو ـــــ ہائے اتنے جولی فیلو JOLLY FELLOW ہیں۔ ـــــ سدا ہنستے ہی رہتے ہیں ـــــ اور سنئے آنٹی ـــ سلمٰی نے اسے خوش خبری سنانی چاہی "وہ بے چارے آج کل کام نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہیں نا ـــــ تو ڈیڈی انھیں اپنی فرم میں کوئی کام دینے کا سوچ رہے ہیں۔"

سلمٰی نے مسکرا کر آنٹی کو دیکھا ـــــ مگر آنٹی گڑیا کی آنکھیں بناتی رہی۔

اس دن اسلم صاحب اپنے کمرے میں لیٹے تھے کہ نماز کے کمرے سے خوشبو دار دھوئیں میں لپٹی ایک بھرآئی ہوئی آواز سنائی دی

"تو میری مسکراہٹوں کا امین ہے۔"

اسلم صاحب کو اچانک سا دورہ پڑ گیا تھا، اور وہ بے ہوش ہوگئے تھے۔ نکہت نے آکر انھیں سنبھالا اور ان کے سرہانے بیٹھ گئی۔

نکہت کی آنکھوں سے آنسو گرے اور اسلم صاحب کی پیشانی پر ٹپک پڑے ـــ انھوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا ـــ نکہت ابتک ان کا سر دبا رہی تھی۔

"تو مجھے رلا کیوں رہا ہے خداوند ـــــ تو میری مسکراہٹوں

کا امین ہے ـــــ ایک چھوٹی سی دعا تجھ سے مانگی تھی ـــ کیا وہ بھی قبول نہ ہوگی۔؟"

دل ہی دل میں نکہت دعائیں مانگ رہی تھی اسلم صاحب بڑی دیر سے اس سے پوچھ رہے تھے۔

"تم کیوں رو رہی ہو نکہت"

نکہت بوکھلا کر بولی ـــ "آپ کے لئے ـــــ آپ جلدی سے اچھے ہو جائیے ـــــ گھر کتنا سنسان دکھائی دینے لگا ہے

اسلم صاحب مسکرائے ـــــ گھر تو اس لئے سنسان ہے کہ سلمٰی بھی اب سسرال جانے والی ہے۔

"سلمٰی کو تو جانا ہی ہے مگر، مگر ادھر آپ پلنگ سے جو لگ گئے ہیں۔!" نکہت آنسو روک کر بولی۔

"عمر بھی کہاں تک ساتھ دے آخر ـــــ" وہ بے بسی سے بولے۔

"عمر ـــــ؟ آپ کی عمر ـــــ" نکہت حیرت سے بولی ـــــ "میرے خیال سے آپ کسی طرح چالیس پینتالیس سے زیادہ نہیں"

انھوں نے اپنا سر ہلایا ـــــ ادھر دیکھو یہ چمکتا ہوا تارا

سفید بالوں سے بھرا ہوا سر دیکھو۔ یہاں غم اور عمر نے ساتھ اپنے نشان چھوڑے ہیں۔"

"غم ——— ؟ نکہت کی حیرت دوچند ہوگئی ۔۔ آپ کو کون ایسے غم ہیں۔ خدا نے اتنی آسائشیں دے رکھی ہیں۔ عزت، شہرت، اولاد، دولت سبھی کچھ تو دیا ہے ——— یہ بھی کیا کم بات ہے کہ اپنی اولاد کی شادیاں بھی آپ اپنے ہاتھوں کرنے والے ہیں۔ ۔ ——— سلمی اپنے ہونے والے رشتے سے بہت خوش ہے۔"

اسلم صاحب ریکارڈ کی طرح بجتے چلے گئے۔

"نکہت تم اِن باتوں کو سمجھنے کے لئے بہت چھوٹی ہو۔ ایک اِنسان اپنی زندگی میں صرف دولت، عزت اور شہرت ہی کا خواہشمند نہیں رہتا۔ اُسے سب سے پہلے عورت کا پیار چاہیئے ——— شادی میری بھی ہوئی، ازدواجی زندگی مَیں نے بھی گذاری مگر وہ زندگی کہاں ملی کہ جسے پاکر خوش ہو سکتا ——— شاہینہ نے کبھی مجھے وہ مسرت دینے کی کوشش کی ہی نہیں جو ایک مرد اپنی بیوی سے چاہتا ہے۔ پھر بھی مَیں یہ سوچ کر خوش تھا کہ اچھی خاصی زندگی ہے ——— بیوی ہے بچے ہیں کہ بیوی بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ بچوں کا کیا ہے ——— سلمی کی شادی ہو جائے گی، انوار لندن جانے کی دھن میں ہے اور رہی شانو تو کسی دن وہ بھی اپنے گھر کی ہو جائے گی۔"

نکہت نے کچھ بھی جواب نہ دیا ــــــــ آنسوؤں نے اُس کا دل بوجھ رکھا تھا، ابھی وُہ کچھ کہنے کیلئے منہ کھول ہی رہی تھی کہ جوتوں کی ــــــــ دب دب ہوئی اَور ساتھ ہی افضل صاحب کمرے میں چلے آئے۔ اسلم صاحب نے ذرا سا سر اُٹھا کر انہیں دیکھا اَور نحیف آواز سے بیٹھنے کو کہا۔

جانے اِس ایک لمحے میں کیا بات ہوئی کہ اِسلم صاحب کے چہرے کا رنگ اُڑ سا گیا ــــــــ اَور انہوں نے ناگواری سے آنکھیں بند کر لیں۔

دو تین دن اِس قدر خاموشی سے گذرے کہ کئی بار نکہت نے یہ محسوس کیا کہ جیسے وُہ کوٹھی نہ ہو قبرستان ہو اَور چوتھے دن اچانک اسلم صاحب نے نکہت سے کہا۔

"اب مَیں سمجھتا ہوں اِس گھر کو تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ بہتر ہوگا۔ اگر تم سروس چھوڑ دو۔"

اگر کوئی نکہت کے جسم سے بجلی کا تار لگا دیتا، تب بھی وُہ اس بُری طرح نہ چونکتی، جتنا کہ اس جملے سے چونکی۔

"جی! ــــــــ" وُہ گھٹے گھٹے لہجے میں بس اِتنا ہی بول سکی۔

"ہاں سبا اَب تم سروس چھوڑ دو۔"

"مگر کیوں۔؟" وہ ڈھٹائی سے پوچھ رہی تھی۔

"کہہ جو دیا تمہاری ضرورت نہیں ہے"

اُس نے اُسی ڈھٹائی سے کہا ـــــ "مگر مجھے تو آپ کی ضرورت ہے"

اسلم صاحب نے چونک کر اُسے دیکھا تو اُس نے بات پلٹ دی ـــــ مگر کو ہو نہ ہو آپ کو میری ضرورت ہے ابھی آپ کے گھٹنے کا زخم نہیں بھرا ہے۔

اسلم صاحب نے چونک کر اُسے دیکھا۔

"ہاں اور آپ جب تک صحت مند نہیں ہو جاتے ہیں یہاں سے قدم بھی نہ اٹھاؤں گی چاہے آپ دھکے دیکر ہی کیوں نہ نکالنے کی کوشش کریں ـــــ؟"

اسلم صاحب سر سے پیر تک ایک کمزور اور خزاں رسیدہ پتّے کی طرح لرز کر رہ گئے ـــــ یہ نکہت کیوں اس قدر ڈھیٹ ہے ـــــ کیوں اس قدر مخلص ہے ـــــ انہیں تو آج تک کسی نے اتنی محبت سے اتنی ضد سے مجبور نہ کیا تھا"

یہ کیسی پاگل لڑکی ہے۔

"مجھے معلوم ہے آپ مجھے نکال دینا چاہتے ہیں۔ وہ سر جھکا کر بولی۔

"کبھی بھلا۔" اسلم صاحب نے ٹوہ لینی چاہی۔

در اصل میں کام کچھ نہیں کرتی اور مفت میں دو سو روپے لے لیتی ہوں ۔"

"ٹھیک ——— بلکل ٹھیک ———" اسلم صاحب جل کر بولے۔

"کتنی سچی بات کہی کہ جی خوش ہو گیا ———" وہ نکہت کو گھور کر بولے ——— "اب تم دنیا والوں کی آنکھوں میں کھلنے لگی ہو ——— افضل صاحب تمہیں میری ......" آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے ۔ اُن کی زبان گنگ سی ہو گئی۔

"جی ———" نکہت آنکھیں پھیلا کر بولی۔

وہ دھیرے دھیرے بولتے گئے ——— "وہ تمہیں میری بیوی سمجھتے ہیں۔"

نکہت بالکل نہ چونکی ——— گویا یہ بات خود بھی مدت سے اُس کے دل میں رہی ہو ——— جیسے ——— اس میں اتنی پریشانی اور غم اٹھانے کی کیا بات ہے ——— اگر انہوں نے یا ساری دنیا نے ہی ایسا سمجھ لیا تو کیا برا کیا ——— کیا میں آپ کی بیوی نہیں بن سکتی۔ کیا میں اس قابل نہیں ۔"

کہنے والے اور سمجھنے والے کچھ بھی کہتے اور سمجھتے رہیں اس سے ہمارا

کیا بنتا بگڑتا ہے ؟" وہ رسان سے بولی۔

"اسلم صاحب بپھر گئے ـــــ کچھ بگڑتا ہی نہیں ـــــ ؟ تمہاری کچھ عزت ہے کہ نہیں ـــــ میں ٹھہرا آدمی اور پھر بوڑھا آدمی ـــ کوئی میری طرف اُنگلی اُٹھائے بھی تو کچھ نہ بگڑے گا، مگر تم ایک لڑکی ہو ـــ تمہیں اپنی زندگی شروع کرنی ہے ـــ ابھی تمہاری شادی ہونی ہے، تمہیں دوسرے کے گھر جانا ہے ـــ اس سے تمہارے جیون پر کتنا اثر پڑے گا۔ اور پھر سلمان سُنے گا تو کیا سوچے گا؟"

نکہت کو جیسے کسی نے آسمان سے اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسلم صاحب کو دیکھنے لگی۔ اِس اِنسان میں فرشتوں کا سا تقدس اور پاکی آئی کہاں سے ـــــ یہ اِنسان ہے یا کوئی آسمانی مخلوق ـــــ وہ کتنی ہی دیر تک آنکھیں کھوئے انہیں دیکھتی رہی ـــــ بڑی دیر بعد جیسے اُسے ہوش آیا تو وہ جاتے جاتے بولی۔

"مجھے دُنیا کی کوئی پرواہ نہیں ـــــ مجھے اپنے محسن سے بڑھ کر کوئی بھی عزیز نہیں۔"

رات کو سب سو گئے مگر نکہت کے کمرے کی لائٹ دیر تک جلتی رہی ـــــــ اسلم صاحب کے زخم میں آج رہ رہ کر ٹیسیں اُٹھ رہی تھی۔ اِس قدر اچانک وہ گر گئے تھے کہ وزن ہی نہ سنبھال سکے اور ٹیک سے نیچے گر پڑے۔ اُس دن موسم بے حد خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی ـــــ بوندا باندی کے بعد سنہری دھوپ نکل آئی تھی ـــــ ایسے میں بچوں نے نکہت سے پکنک کا کہا تو اُس نے اسلم صاحب کو بھی ساتھ گھسیٹ لیا۔ کمپنی گارڈن سے لگ کر ایک ٹیک تھا جو کافی اونچا تھا ـــــ چوٹی پر پیلے نیلے جنگلی پھولوں کے پودے تھے اور دھوپ میں چمکتی ہوئی سبز گھاس ـــــ وہ سب پھولوں کی تلاش میں اُوپر جارہے تھے۔ اور پھر جانے کیسے اُن کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتے چلے گئے ـــــ

جب انہیں موٹر میں لاد کر گھر لایا گیا تو تب تک تکلیف کی شدت سے اُن کا پاؤں اچھا خاصہ سوجھ چکا تھا۔ کنپٹی کے پاس ایک ہلکی سی چوٹ آئی تھی جس سے اُن کا سر دھمک رہا تھا ـــــ نکہت اپنا آپا بھول بیٹھی تھی۔

اسلم صاحب نے اُسے کبھی اجازت نہ دی تھی کہ وہ اُن کا اپنا کوئی کام کرے ——— پہلے تو نکہت ہاتھ مَل مَل کر بے بسی سے باہر ہی کھڑی رہی ——— پھر اس سے صبر نہ ہو سکا تو نجمی سے کہہ کر ڈاکٹر کو فون کروا دیا۔ اور خود بے تابی سے ساتھ اُن کے سرہانے جا بیٹھی ——— وہی لمحہ ایک ایسا لمحہ تھا۔ جب اُن کے سرہانے بیٹھ کر اُس نے اپنی زندگی کے ہر ہر دن کے بارے میں سوچا تھا ——— اشتہار سے لیکر آج تک کی زندگی ——— اس کا آنا ——— رہ جانا ——— سب میں گھل مل جانا ——— گھر کی ایک اہم ہستی بن کر رہ جانا ——— پھر سلمٰی کی شادی ——— اپنا کنوارپن ——— سلمان کی محبت ——— اُسے سب کچھ یاد ہے ——— وُہ ذہن کی آنکھوں سے ہر منظر کو گزرتا دیکھتی رہی اور پھر وہ لمحہ کہ اسلم صاحب نے اُسے گھر چھوڑ دینے کو کہا۔ بھلا وُہ اِس گھر کو کیسے چھوڑ سکتی تھی؟؟

پھول کبھی ڈال سے جُدا ہوا ہے ——— ہوتا کیوں نہیں۔ ——— ضرور ہوتا ہے، مگر پھر مر بھی تو جاتا ہے نا ——— ؟؟

نکہت کے دل میں گویا بے غیرتی نے گھر کر لیا تھا ——— وہ دن رات اِس تندہی سے اسلم صاحب کی خدمت کر رہی تھی کہ ساری

دنیا کو بھول کر رہ گئی تھی ——— اُس نے اسلم صاحب کی اِس قدر بے لوث خدمت کی، اُن کا اتنا سُکھ دیا، اُن کیلئے اِتنا جاگی کہ خود اپنی صحت برباد کر بیٹھی ——— اور ایک دن اسلم صاحب نے اسی خوشبودار دعوئیں میں لپٹی وہ بھرائی ہوئی دعا سُنی۔

"میرے مالک تو میری عمر بھی اُنہی کو دے دے۔"

نکہت اور اسلم صاحب کی دُنیا مختلف تھی۔ ایک غریبی کے ——— روز و شب کے دامن میں پلی ہوئی، جس کے احساسات محدود تھے، جس کے ذہن کی اُڑان محدود تھی، جس کے سوچنے کے زاویے خلوص، محنت اور محبت سے آگے نہیں بڑھ پاتے تھے اور دوسری شخصیت سرمایہ کے نرم و لطیف آغوش میں پروان چڑھی تھی۔ اِس شخصیت کے احساسات مادّی دنیا کو زیر کرنے کی لامحدود تمنائیں لئے ہوئے تھے۔ لیکن روز و شب کی بساط پر چلتے چلتے اسلم صاحب کی شخصیت زندگی کی ایسی وادیوں سے گزر رہی تھی، جہاں انسان دِل میں اپنی خواہشات کی گرمی اور دماغ میں اُن خواہشات پر فتح پانے کا حوصلہ

لئے رہتا ہے۔ دِل کہتا ہے کہ مستانہ وار جھوم اور دماغ اس شخصیت کی خواہشات کو لگام دیتا ہے، آنکھیں مدہوش ہونا چاہتی ہیں اور ذہن و شعور کی آنکھیں اُسے فکر عطا کرتی ہیں اُسے احساس دلاتی ہیں کہ نیکی اور صداقت کے حسن کو پانا ہی زندگی کی معراج ہے۔

نکہت جیسی شخصیتوں کے احساسات بھی اپنی امکانی منزل تک پہنچ کر صرف محبت کر سکتے ہیں، محبت جو نیکی کا سب سے اہم اور واحد نقش ہے۔

یہ دونوں شخصیتیں اپنے فطری رجحانات کے مطابق اپنی اپنی منزلوں کی جانب بڑھ رہی تھیں۔

نکہت کے دِل میں ایسی محبت کا دریا موجزن تھا جس کا جواز جذبات خلوص اور صداقت سے پیدا ہوتا تھا۔ پھر اُس کے احساسات کو ابھی تک عشق کے لمس کی لذت محسوس نہیں ہوئی تھی پہلی بار اُسے اسلم صاحب سے یہ فطری ربط محسوس ہوا اور تمام تر اپنائیت کے ساتھ محسوس ہوا، وہ سوچتی تھی ——— میں یہ سمجھتی ہوں کہ عورت صرف محبت ہے عبادت ہے ——— میں عورت ہوں میرا وجود بھی محبت ہی محبت ہے ——— میں کیسے اپنے منہ سے اقرار کروں مگر محبت بھی کہیں چھپائے چھپ سکی ہے ——— سچ تو یہ ہے کہ میں نے

اپنی زندگی میں اگر صحیح معنوں میں کسی کو چاہا ہے تو صرف اسلم صاحب کو ـــــ مگر میرے سینے میں یہ خلش کانٹا بن کر کھٹکتی ہے کہ میں اُن کا دِل کیوں نہ جیت سکی ـــــ مجھے وُہ دِن آج بھی یاد ہے کہ جب اپنے ٹوٹے ہوئے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر میں نے اسلم صاحب کو ایک خط لکھا تھا ـــــ میں نے کوئی چاپلوسی نہیں کی تھی، کوئی خوشامد نہیں کی تھی، مگر ہوا یوں کہ جب میرا خط اُن تک پہنچا تو وُہ اللہ کے خط بھول گئے اور مجھے اپنے بچوں کیلئے رکھ لیا۔

محبت کا دیوتا کیوپڈ، سُنا ہے اندھا ہوتا ہے ـــــ جانے کیا بات تھی، جب میں نے اسلم صاحب کو پہلی بار دیکھا، تبھی میں نے محسوس کیا کہ میں کچھ کھو رہی ہوں، کچھ پا رہی ہوں ـ میں نے کیا کھویا تھا ـــــ شاید اپنا دِل ـــــ مگر کیا پایا ـــــ آج تک نہ سمجھ سکی ـــــ شاید محبت پائی ـــــ مگر یہ تو میرا واہمہ ہے ـــــ میں نے صرف کھویا، پایا کچھ نہیں ـــــ وُہ دِن وہ لمحہ تو مجھے آج تک نہیں بھولتا جب پہلی بار میں مجبور سی ہو کر اسلم صاحب کے گلے لگ گئی تھی ـــــ اُس لمحے میں نے یوں محسوس کیا تھا کہ میں آسمان کے محفوظ سائے تلے آ گئی ہوں ـــــ اب مجھے کوئی ڈر نہیں کوئی فکر نہیں ـــــ سچ مچ اسلم صاحب میرے لئے

آسمان تھے ـــــ وُہ میرے سر پر آسمان بن کر تن گئے اور میں سب
کچھ بھول گئی اور یہ بھی بھول گئی کہ وُہ ایسی چیز نہ تھے کہ جسے میں
پا سکتی ـــــ میں بیس سال کی ایک لڑکی جس نے دنیا میں صرف
غم ہی غم دیکھے تھے، خوشیوں کے گہوارے میں جھولنے لگی ـــــ مجھے
اُن کے سفید بال، اُن کے قدرے جھکے جھکے اعضا ـــــ اُن کا
دھیما دھیما اندازِ تکلّم ـــــ اُن کی چال ڈھال ہر ہر چیز سے
کس قدر گہری محبت تھی ـــــ ؟ (تھی ـــــ ؟ ؟ میں صیغۂ ماضی
کیوں استعمال کر رہی ہوں ؟)

میں تو پہلے لمحے ہی بھانپ گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو کر رہے گا
ـــــ کتنے پیار سے اُنہوں نے مجھے ساڑیاں لا کر دی تھیں ـــــ
ـــــ وُہ محض ایک بات تھی اور اب مجھے ایک ساتھ کتنی باتیں یاد
آتی ہیں ـــــ آہ ہی ہیں ـــــ اُنہوں نے وعدہ کیا تھا کہ
تنخواہ پر کپڑوں کے پیسے کاٹ لیں گے، مگر کبھی وُہ لمحہ نہ آیا جب
وُہ اپنا وعدہ پورا کرتے ـــــ یوں اُن کا وعدہ سے پھر جانا بھی
کتنا بھلا لگتا تھا مجھے ـــــ ؟

میں آج تک نہ جان پائی کہ اُن کی فطرت میں یہ تبدیلی کہاں سے
اُمڈ پڑی تھی ـــــ پہلی بار جب میں نے اُن کی کوٹھی میں قدم دھرا

وہ دن اور آج کا دن، مجھے کبھی اُن سے شکایت کا موقع نہ ملا ——
کبھی کبھی میرا جی چاہتا کہ وہ مجھے کسی بات پر ڈانٹ دیں —— یہ نہیں
تو مجھے ہی اُن کی کوئی بات بری لگنے لگے کہ میں انہیں جھڑک سکوں ——
شاید اسی طرح محبت کا سویا دیوتا جاگ پڑتا ——! اگر وہ تو
برف کی چٹان تھے، کبھی میں نے اس بات پر لڑنا بھی چاہا کہ آخر
آپ مجھے نو سو روپے کاہے کو دیتے ہیں —— کچھ کام دھام
میں نہیں کرتی —— موٹر میں گھومتی ہوں —— نت نئے کپڑے
اور زیورات پہنتی ہوں، اور پھر بھی تنخواہ جوں کی توں برقرار ——
نجمی کا بے حد کم کام میرے ذمہ تھا —— (میں تو جیسے اس
گھر میں رانی بن کر ہی آگئی تھی) سلمیٰ سب سے بڑی تھی اور وہ
بہت کم میری مدد لیا کرتی —— پہلے ہی دن میں نے اس کا کام
کرنا چاہا تو اس نے شرما کر منہ پھیر لیا —— لڑکیاں جب بڑی
ہو جاتی ہیں تو اپنی تنہائیوں کا کسی کو بھی ساتھی نہیں بنانا چاہتیں اور
پھر بعد میں اُس کی شادی بھی ہو گئی —— رہے انوار اور
نجمی —— (نجمی جسے اسلم صاحب اپنی مرحومہ مسز کے نام پر
اکثر شانو کہہ کر پکار لیا کرتے تھے) اُن کا کام ہی کیا تھا ——
بس نگرانی، نوکر تو خود ہی ڈھیر سارے موجود تھے اور پھر اسلم صاحب

جو اتنی بڑی تجارتی فرم کے مالک تھے ــــــ؟ بھلا وُہ مجھے کسی کام کو ہاتھ لگانے دیتے ــــــ وُہ تو چاہتے تھے کہ مَیں پھول تک نہ توڑوں ــــــ (مگر ہائے اُنہوں نے میرا پھول جیسا دل توڑ دیا ــــــ)

بیماری میں اِنسان ایسی تنہائی اور ویرانی محسوس کرتا ہے کہ سارے کفر ٹوٹنے لگتے ہیں۔ جب وُہ ٹیک پر سے گر سے تھے اور درد سے بے حال تھے، اُس سمے مَیں نے اُن کے سارے حکم بھُلا دیئے اور اُن کی تیمارداری میں جُت گئی ــــــ وُہ مجھے بار بار منع کرتے، مجھے گھور بھی لیتے مگر کبھی وُہ نگاہ نہ پھینکی کہ جسے مَیں محبت کا نام دے سکوں ــــــ اندھیرے اجالے کتنے ہی ایسے موقعے آئے ہوں گے مگر اُنہوں نے کبھی میرا ہاتھ پکڑ کر اُسے چومنے تک کی بھی کوشش نہ کی ــــــ یہ جان کر میرا دِل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا کہ مَیں اتنے سال ان کے ساتھ رہ کر بھی ان کی محبت حاصل نہ کر سکی۔

کیا مَیں اِتنی بُری تھی ؟

میرے لانبے لانبے بال ہیں ــــــ بادامی آنکھیں ہیں ــــــ اُونچا سا ڈولتا ہوا قد ہے ــــــ سانولی رنگت ایسی روشنی لئے ہوئے ہے جیسے برسات کی شام کو بادل برس چکنے پر سورج نکل آئے ــــــ غریبی کے دِنوں کی بات مَیں نہیں کر رہی ہوں، مَیں تو ان دِنوں کی بات سنا رہی ہوں

کہ جب محبت کا تیر کھا کر میرے تینوں کے چراغ ستاروں سے بھی بڑھ کر روشن ہو گئے تھے۔ کیا ان چراغوں میں اتنی بھی روشنی نہ تھی کہ کسی کو اپنی طرف کھینچ سکتے۔ میں نے تو یہی سنا ہے کہ اندھیری راتوں میں بھٹکنے والے سدا روشنی کی طرف لپک پڑتے ہیں ـــــ پھر ـــــ پھر ـــــ

وہ مجھے اپنی نیلی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر اپنے برابر بٹھا کر شاپنگ کو لے جاتے تھے، پکچر دکھانے لے جاتے تھے۔ سب لوگ ہم دونوں کو دیکھتے تو مجھے کبھی یہ غم نہ ستاتا کہ میرے جوان اور تنے ہوئے اعضا کے مقابلہ میں اُن کا جسم قدرے جھکا جھکا سا دکھائی دیتا ہے ـــــ میرے سیاہ چمکدار بالوں کے مقابل اُن کے بال چاندی کے تاروں کی طرح چمکتے ہیں ـــــ یہ ایسی غم کی بات بھی کہاں تھی، اندھیرے اجالے سدا ہی ساتھ چلتے رہے ہیں ـــــ جب شاپنگ کرنے کے بعد وہ مجھ سے کہا کرتے "نکہت ذرا بل تو پے کر دینا۔"

اس لمحہ مجھ میں ایک بیوی کی فرماں برداری آ جاتی تھی اور جب کبھی کوئی پکچر دیکھتے ہوئے وہ مجھ سے کسی سین کے بارے میں رائے پوچھتے تو میں خود ہی مغرور ہو جاتی۔ لیکن میری خوشیاں اور میرا غرور کسقدر کم ہوتا تھا۔

اور پھر اس دن میری خوشیوں کی آخری کرن بھی دم توڑ گئی۔ سلمیٰ کی شادی ہو چکی تھی اور ایک بچی بھی ہو گئی تھی۔

ایک دن اسلم صاحب کی رشتوں کی کوئی بہن اُن سے ملنے آئی ہوئی تھیں ـــــ

وہ لوگ بیٹھے ڈرائنگ روم میں باتیں کرتے رہے اور میں اُدھر سلمیٰ کی بچی کو بیٹھی بہلاتی رہی، کسی کام سے اُٹھ کر میں ادھر گئی تو میرے کانوں نے مدھم سی بھن بھناہٹ سُنی ——— میرے قدم یونہی رُک گئے۔ آپا کہہ رہی تھیں۔

"اسلم میاں مجھے تو وہ لڑکی بہت پسند آئی ہے جو تمہارے بچوں کا کام کرتی ہے۔"

"جی ہاں! بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ وہ سیدھے اور مدھم لہجے میں بولے۔

"پھر یہ تو بہت اچھا ہے کہ تمہیں پسند بھی ہے۔"

"جی ———" وہ ذرا چونک پڑے۔

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ تم اُسے ہمیشہ کیلئے ہی اپنے ہاں رکھ لیتے تو ———"

وہ جیسے اچھل کر بولے ——— "آپ کا مطلب اُس سے شادی کر لوں۔"

"اور کیا کہہ رہی ہوں" ——— وہ ذرا ہنس کر بولیں۔

تھوڑی دیر بڑی عجیب خاموشی رہی پھر بولے ——— مگر مجھے اُس سے محبت نہیں ہے ———"

میں وہیں کھڑی کھڑی، کئی بار جی اور کئی بار مری ——— وہ کہہ رہے تھے۔

اُس کی میری عمر کا فرق بھی آپ نے دیکھا ہے آپا۔ اور پھر آپا اُس کی خود شادی ہونے والی ہے۔ اُس کا منگیتر سلمان میری ہی فرم میں کام کرتا ہے، بڑا اچھا لڑکا ہے، اسے بے پناہ چاہتا ہے۔

"اِس سے کیا فرق پڑتا ہے آپا بولیں سوال لڑکی کی بھی پسند کا ہوتا ہے۔

وہ بولے ـــــ "آپا آسمان پر ایک ساتھ چاند سورج نہیں جگمگا سکتے ۔ یا تو چاند چمک لے یا سورج ہی ۔"

"تو سورج ہی چمک جائے ـــــ" آپا ہنس کر بولیں ۔

وہ پھر گئے ـــــ "یہ تو میں نے بات جیسی بات کہی آپی ۔ آپ خواہ مخواہ کسی کو میرے سر لادنے کی کوشش کیوں کر رہی ہیں ۔ ؟"

اور تب میں نے جانا کہ دنیا میں خوشی کے لمحے کس قدر کم ہوتے ہیں ـــــ مجھے برسات کی وہ شامیں بہت پسند ہیں ۔ جب ہلکی ہلکی پھوار آسمان سے گرتی ہے ۔ اور چہرہ بھیگ بھیگ جاتا ہے ـــــ اور پھر یوں ہوا کہ میری آنکھیں خود برسات برسانے لگیں اور چہرہ سدا بھیگا بھیگا رہنے لگا ۔

اس دن جب انہوں نے افضل صاحب کی کسی رکیک حرکت پر چڑ کر کہا تھا کہ وہ ہمارے تعلقات کو غلط رنگ میں دیکھنے لگے ہیں ۔ تب میں کس قدر خوش ہوئی تھی ـــــ میں سمجھ رہی تھی کہ اس طرح وہ خود کو اور مجھے دنیا والوں کی چبھتی ہوئی نگاہوں سے بچانے کیلئے کوئی ایسا راستہ اختیار کر لیں گے ۔ جہاں کوئی اونچ نیچ نہ ہو ـــــ شاید ـــــ شاید ہم ایک ہو جائیں میں نے ڈرتے ڈرتے سوچا تھا ـــــ مگر ـــــ مگر ـــــ ؟

میں نے یہ بھی تو سوچا تھا کہ چونکہ انہوں نے بیوی کی محبت دیکھی ہی نہیں ہے ۔ تو شاید اس طرح وہ میری خدمت گزاری اور بے پناہ پیار کو دیکھ

کہ میری طرف جھک سکے ۔۔۔۔ مگر وہ تو یونہی آسمان بنے میرے سر پر تنے رہے
بھلا آسمان بھی کہیں زمین پر جھکا ہے ۔۔۔۔؟ نہ آسمان زمین تک آسکا
ہے نہ زمین کبھی اتنی اونچی ہو سکتی ہے کہ بڑھ کر آسمان کو چھو لے ۔
مجھے آج نہ کل، کبھی نہ کبھی، سلمان کا ہونا ہی ہے مگر کلیجے میں ایک پھانس
سی اٹکی ہوئی رہتی ہے ۔۔۔ میں کیوں ان کی محبت حاصل نہ کر سکی ۔۔۔ انہوں
نے مجھ سے شادی نہ کی نہ کرتے مگر کبھی اتنا تو کہہ دیتے ۔۔۔۔ میں تم سے
محبت کرتا ہوں، میں نکہت سے محبت کرتا ہوں ۔"

ادھر جب سلمیٰ کی شادی ہوئی تھی کوٹھی کی رونق اک دم کم ہو گئی تھی اور پھر
جب سلمیٰ کے بچے ہوئی اور بچی کو لے بار بار آنے اور جانے لگی تو بے رونقی
میں اور اضافہ ہو گیا ۔۔۔ سلمیٰ اسلم صاحب کی بے حد لاڈلی تھی ۔۔۔۔ وہ
دن بھر اپنے کاموں میں معروف رہتے مگر کبھی بات کرتے تو بچوں سے اور
کھیلتے تو بس سلمیٰ کے ساتھ ۔۔۔۔ بیڈمنٹن اُن کا پسندیدہ گیم تھا ۔۔۔۔ سلمیٰ
کی شادی ہوئی تو وہ کھیل کود بھی ختم تھے ۔۔۔۔ انوار نے پرموشن
حاصل کر کے سینئر کیمبرج پاس کر لیا تھا اور اب لندن الحسنہ کی دُھن میں تھا ۔

کو ٹھی میں رونق اور زندگی تھی تو نکہت کے دم سے ، اُس نے یہاں ہر کام میں بلے حد پابندی پیدا کر دی تھی ہمارے دن کی زندگی کو اِس طرح اپنے بس میں کر لیا تھا کہ ہر جگہ وُہی وُہ براج رہی تھی ـــــ اسلم صاحب کسقدر خوش اور مطمئن تھے بچے صاف ستھرے رہتے، کمرے ترتیب سے سجے رہتے اور بڑی بات یہ کہ اب بچے نماز بھی پابندی سے ادا کرتے ۔ یہ بڑی بات تھی کہ وُہ سب اب اِس قدر ذمہ دار ہو گئے تھے ۔

اور پھر ایک دن وہ سب بمبئی میں تھے ـــــ انوار لندن جا رہا تھا ـــــ اسلم صاحب نے نکہت کو بمبئی کا چپہ چپہ گھما دیا ۔ تاج محل میں کئی بار ڈنر کھلایا ۔ ڈانس پارٹیوں میں لے گئے ۔ سمندر کے کنارے لے گئے ۔ بوٹنگ کیلئے لے گئے ۔ جوہو پر اُس سے تیر نے کو کہا ۔ اگر اُس نے BY THE WAY کسی چیز کی تعریف کر دی تو وُہ چیز جھٹ اُسکے لئے خرید لی ۔

اب تو تمہاری شادی ہو جائیگی ۔ کون جانے پھر گھومنے پھرنے کا موقع ملے نہ ملے ۔"

وُہ دکھا ہوا دل لئے ہنس ہنس کر اُن کی باتیں مانتی رہی ـــــ آنکھوں میں آنسو چھپائے وہ لبوں پر مسکراہٹ پیدا کرتی رہی ۔

حیدر آباد واپس پہنچ کر اُس کا دل سدا اُکھڑا اُکھڑا سا رہنے لگا ـــــ انوار اُس کا بہترین دوست تھا ۔ یُوں اُن کی عمروں میں خاصہ فرق تھا ، مگر ۔

نکہت اُس کی موجودگی میں سدا ہنستی ہی رہتی۔ لاکھ وُہ ہنسی جھوٹی ہی سہی، انوار اپنے ساتھ اُس کی مسکراہٹیں بھی لیتا گیا۔ اسلم صاحب شاید اُس کی اُداسی کو بھانپ رہے تھے۔ ایک دن اُسے غور سے دیکھ کر بولے۔

"تم آجکل کچھ غمگین نظر آتی ہو۔ کیا بات ہے۔؟

اس وقت وہ شانو کو بیٹھی انگلش پڑھا رہی تھی۔ کوئی فیری ٹیل تھی "تب پری ہاتھ جوڑ کر بولی کہ تم سمجھے ہی نہیں شہزادے میں تم سے دل ہی دل میں پریم کرتی آ رہی ہوں۔"

جواب میں نکہت نے شانو سمجھا سمجھا کر پڑھانا شروع کر دیا۔ تو تم سمجھیں شانو بیٹا کہ پری دراصل شہزادے......"

"ہی ہی کھی کھی...... شانو منہ پہ ہاتھ رکھ کر زور سے ہنسی "مگر آپی اچھی پری کو ایسے بڈھے شہزادے سے محبت کیسے ہو گئی۔؟"

"شہزادہ تھا تو بڈھا مگر بہت نرم دل تھا شانو۔ اگر......"

اسلم صاحب نے شانو کے ہاتھ سے کتاب لی اور دھیرے سے میز پر رکھ کر بولے۔ "آج سلمان کہہ رہا تھا کہ اُس کی اماں بہت جلد گھر میں بہو لانا چاہتی ہیں۔" وہ ہلکے ہلکے مسکرا رہے تھے۔

نکہت کچھ نہ بولی۔ سر جھکائے یوں بیٹھی رہی جیسے پتھر کی مورتی ہو۔

"نکہت" وہ ذرا زور سے بولے۔ "سلمان تمہیں بے حد چاہتا ہے، بڑی

طرح پیار کرتا ہے ـــــ تمہیں کسی کی محبت کی قدر کرنی چاہئے ـــــ میں نے بھی زمانہ دیکھا ہے ـــــ لڑکیوں کے مزاج پہچانتا ہوں۔ تمہیں" نکہت نے چونک کر سر اُٹھایا ـــــ وہ کہہ رہے تھے ـــــ تمہیں گلاب اور دھتورے میں تمیز کرنی چاہیئے۔"

شعلے

کانونٹ میں چھٹیاں ہو گئی تھیں ــــــ شانو سلمیٰ کی
بچی نیکی پر جان دیتی تھی ــــــ اب پڑھائی
کا بار تو تھا نہیں ــــــ سلمیٰ جانے لگی تو شانو کو
بھی اپنے ساتھ لیتی گئی۔
ــــــ کوٹھی میں اب ویرانیوں کا راج تھا۔
ایک دن اسلم صاحب نے نکہت کے کمرے
پر وُہی ہلکی سی مخصوص دستک دی ــــــ نکہت
نے دروازہ کھولا تو وُہ دو چار بڑے بڑے پیکٹ
سنبھالے اندر چلے آئے۔
"نکہت ــــــ آج مَیں تمہاری امی کے پاس گیا

تھا ـــــــ ہم نے شادی کی تاریخ طے کر لی ہے۔ اور دیکھو یہ کچھ کپڑے ہیں ـــــــ زیورات کا آرڈر میں نے آج ہی دیا ہے ـــــــ آٹھ دس دنوں میں بن کر آجائیں گے ـــــــ پھر ضروری کپڑا بھی بعد میں خرید لیا جائے گا۔ نکہت نے بے بسی سے سر اُٹھا کر اُنہیں دیکھا تو وہ مسکرا کر بولے۔

"ارے بھئی مجھے معلوم ہے کہ تمہاری امی سیّد صاحب کی بیوی ہیں۔ میں نے اُن سے بہت منتوں کے بعد یہ وعدہ لیا ہے کہ نکہت کی شادی میں کروں گا کیونکہ اُس کے مجھ پر اتنے احسان ہیں کہ شمار ہی نہ کئے جا سکیں۔ یہ میری ننھی سی خوشی ہے جس کا پورا کرنا آپ کے بس میں نہیں ہے۔"

نکہت جیسے آپ ہی آپ بول پڑی۔

"کاش آپ بھی کسی کی ننھی سی خوشی پوری کر دیتے۔"

مگر تب تک اسلم صاحب جا چکے تھے۔

اُس کے چند دنوں بعد کی بات ہے کہ اسلم صاحب اسی دوالونگ چیئر

میں بیٹھے کوئی کتاب دیکھ رہے تھے کہ دھویکں میں لپٹی تھرتھراتی دعا
اُن کے کانوں سے ٹکرائی۔
"کیا واقعی تو جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے ——— اَب تو دعاؤں سے
بھی ہاتھ اُٹھا لیا ہے خداوندا —!"

یہ شاید زندگی کا خاتمہ تھا کیونکہ اُس دِن کے بعد پھر کبھی نکہت
نہ مسکرا سکی۔ البتہ اسلم صاحب مسکراتے رہتے ——— اُنہوں نے بڑی
منتوں سماجتوں کے بعد سیّد صاحب کی بیوی کو صرف چند دنوں کیلئے
کوٹھی بلوا لیا تھا ——— شادی کے ہنگامے عروج پر تھے۔ اِدھر
اُدھر کے بلائے اور پھر بِن بلائے مہمانوں سے کوٹھی اٹی پڑی تھی اور
یوں بھی کوئی بڑی جگہ ہنگامہ ہوتا ٹھہرتا ہے تو آس پاس والے تو
یوں کھنچ آتے ہیں جیسے گڑ پر مکھیاں۔
جب زوردار بلینڈ بجا اور بچوں نے شور مچایا کہ برات آگئی۔
——— برات آگئی ——— نکہت کا دِل اتنی زور سے دھڑکا کہ اُس
کا پورا جسم لرز اُٹھا ——— اُس گھڑی کی تو وُہ بہت دنوں سے

منتظر تھی۔

"تو یعنی یہ سب کچھ اب ہو ہی رہا ہے ——— اب وہ اپنے اصلی گھر جا رہی ہے ——— اور یہ جو کچھ تھا خواب تھا۔ جھوٹ تھا۔ ایک سراب تھا ——— اور وہ جو خوابوں کا شہزادہ تھا؛ بجائے تاج کے جس کے سر پہ سفید بالوں کا سورج سا جگمگاتا تھا آپ اس کے لئے محض ایک خیال ہے ——— اسے ہنسی آگئی۔

اسلم صاحب نے پھولوں میں لپٹے ہوئے سلمان کو دیکھا ——— ——— وہ اس قدر خوش تھا کہ اس کا چہرہ چاند بن کر چمک رہا تھا ——— بعض لوگ اس قدر خلوص سے کوئی دُعا مانگتے ہیں کہ اللہ میاں کو قبول کرتے ہی بن پڑتی ہے ——— تو آج وہ اس کی ہے۔

(بالآخر تم نے اسے جیت ہی لیا۔ مسٹر سلمان ایم ایس سی ہے نا ؟؟)

"نگہت آج میں بہت خوش ہوں کہ سلمان جو تمہیں اس قدر چاہتا تھا آج تمہارا ہے اور تم اس کی ہو ——— بہت خوبصورت جوڑا ہے تم دونوں کا ——— دیکھو جس طرح تم نے دُکھی کے

ہر ہر فرد کا دل جیت لیا تھا اسی طرح اپنی سسرال میں بھی کرنا یہاں کا تو خیر چپّہ چپّہ تمہیں یاد کرے گا۔"

"تو یہ آپ کہہ رہے ہیں اسلم صاحب کہ یہاں کا چپّہ چپّہ مجھے یاد کرے گا ——— کیا سچ ؟ اور کیا چپّے چپّے میں آپ خود بھی نہیں شامل ہو جاتے ——؟؟"

یہ کوٹھی ہے یا قبرستان ؟

ہر چیز ساکن تھی ——— پرسکون —— جیسے ہر روز طوفان کے بعد سمندر کی سطح چپ چاپ ہو جاتی ہے ——— وہ باجوں کی ڈھما ڈھم ——— وہ باراتیوں کی دھوم دھام ——— بچوں کا شور شرابہ ——— سب کچھ ختم تھا۔ اور اب وہ کمرہ جہاں کئی سالوں سے ایک جنّت آباد تھی —— خاموش آوازوں سے پوچھ رہا تھا ——— وہ کہاں گئی ——— وہ کہاں چلی گئی۔"

اور خوشبودار دھواں بل کھاتا ہوا یونہی کمرہ میں آوارہ آوارہ سا پھر رہا تھا ——— اب کوئی دعا کانوں میں رس نہ گھولتی تھی ——— اور یہ کم بخت دل کا بوجھ ——— !

"جب کبھی میں اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کرتی ہوں، خدا کے سامنے سر جھکا کر سب کچھ کہہ ڈالتی ہوں۔ اگر ایسا نہ کروں تو شاید میرا دل پھٹ جائے۔"

خداوندا میرا دل نہ پھٹ کر رہ جائے ——— مگر یہ تو اچھا ہی ہوا نہ کہ میں نے سلمان کا دل نہ توڑا ——— کتنی اچھی جوڑی ہے ——— جیسا کہیں پرانے گیرج میں نئی گاڑی اچھی لگتی ہے مسٹر اسلم ——— ؟

انہوں نے زور سے اپنا دل پکڑ لیا ——— خوشبودار دھوآں کمرے میں یونہی چکر لگا رہا تھا ——— وہ بے تابی سے اٹھے اور کمرے میں جاکر سجدے میں گر پڑے۔

تھرتھراتی دعا ان کے لبوں پر مچل اٹھی۔

"میں ——— میں نکہت سے محبت کرتا ہوں، خداوندا ——— میں نکہت سے محبت کرتا ہوں ——— !

———٭———

ہماری نئی مطبوعات

یادوں کی اِک دھنک جلے

قرۃ العین حیدر ہمارے ادبی اُفق پر ایک ایسا تابناک ستارہ بن کر نمودار ہوئیں کہ فضا میں روشنیوں کا سیلاب اُمنڈ آیا۔

وہ اپنے قلم کے جادو سے ایسی سحر طرازی کرتی ہیں کہ قاری مبہوت ہو جاتا ہے۔ افسانہ کہنے کا فن نکتۂ کمال پر دیکھنا مقصود ہو تو یہ مجموعہ پڑھیے

سفید کاغذ۔ مضبوط کپڑے کی جلد۔ چار سو صفحات

قیمت آٹھ روپے

فصلِ گُل آئی یا اجل آئی

روایتی افسانہ نگاری کی دُنیا میں ہوا کا تازہ جھونکا ایک ایسا روزن جس میں سے انسانی ذہن کی تمام بھول بُھلیوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ مجموعہ زبان و بیان کی رنگینیوں اور قصّہ کی لطافتوں سے بھرپور ہے۔

افسانوں کا ایک ایسا انتخاب جو آپ کو بے شمار تخلیقات کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گا۔

سفید کرتافلی کاغذ ، مضبوط کاغذ

قیمت پانچ روپے

زہرِ عشق

" احمد منظور "دُنیائے ادب کا ایک نیا انکشاف ہے
لیکن روایت اور جدّت کے برتنے میں جس قدر ہنرمندی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ پرانے ادیب اُس فن سے یکسر ناواقف ہیں۔
الفاظ کے محتاط استعمال کی اس سے بہتر مثال ملنا محال ہے۔
ایک عظیم ناولٹ جو سچ مچ خونِ جگر کی سُرخی سے رقم ہوا ہے۔
سفید کرنافلی کاغذ ——— مضبوط جلد
قیمت تین روپے پچاس پیسے

نئی اور خوب صورت کتابیں

بازگشت بانو قدسیہ 7.50	تخلیق اور ایجاد سید قاسم محمود 3.00
فصل گل آئی یا اجل آئی قرۃالعین حیدر 5.00	اک اوپری کڑی رفعت 3.00
یاد کی اک دھنک جلے قرۃالعین حیدر 8.00	کاک ٹیل کرشن چندر 12.00
دو ہاتھ عصمت چغتائی 6.00	دشت خیال کرشن چندر 6.00
بنجر کھیت اکمل علیمی 3.50	درد کے فاصلے امرتا پریتم 10.00

ادب محل ۔ مسلم کالونی (سمن آباد) لاہور